چناب سے پدما تک

عوامی کہانیاں

چناب سے پدما تک

عوامی کہانیاں

ادارۂ مطبوعات پاکستان، کراچی

تیسرا ایڈیشن

قیمت: دو روپے

فہرست مضامین

وادیٔ بولان:

آبِ رواں کی سرزمیں:

فردوس بر روئے زمیں:

پیش لفظ

دورِ جدید افسانوں ہی کا دور سہی — افسانے جو کسی خاص مقصد کے تحت، کسی خاص نکتہ کو واضح کرنے کے لئے تخلیق کئے جاتے ہیں، خود بخود پیدا نہیں ہوتے۔ پھر بھی ہم عوامی کہانیوں میں دلچسپی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسلئے کہ وہ کہانیاں ہیں، افسانے نہیں۔ وہ خود بخود لوگوں کے دلوں اور دھرتی کے سینے سے اُبھرتے ہیں۔ زندگی کی ایک خود رو پیداوار جس میں ایک قدرتی تازگی، ایک لہک، ایک سیدھا سادہ کیف ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو شعور کے سانچے میں خود بخود ڈھلتی ہے۔ ساری قوم کا شعور انفرادی بھی اور اجتماعی بھی۔ تمام لوگ آپس میں رل مل کر، گھل مل کر سوچتے ہیں کسی واقعہ کو، جانے احساس کی کن کن رَوؤں کے تحت، بناتے سنوارتے، ایک سہانا من بھاتا روپ عطا کرتے ہیں۔ شب و روز اپنے جذبات کی نرم گرم لوؤں میں ڈھالتے، اپنے خیالات کی نت نئی لہروں میں سموتے، اپنے تخیل سے آب و رنگ دیتے ہیں۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہوں۔ اور اس خواب کو زیادہ سے زیادہ بیساختہ پیرائے میں پیش کریں۔ اس میں ساری زندگی، ساری روح، ساری تاریخ سمٹ آتی ہے۔ اسی لئے یہ کہانیاں سب ہی کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ چھوٹوں بڑوں، مردوں عورتوں، امیروں غریبوں سب کا محبوب سرمایہ جس میں وہ اپنے ہی خوابوں، اپنی ہی امیدوں، من کی ترنگوں، افتادوں، مسرتوں اور غموں کا عکس پاتے ہیں اور ان سے محظوظ ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کو جان سے بھی عزیز رکھتے ہیں۔

یہ کہانیاں نہ کسی فردِ واحد کی تصنیف ہوتی ہیں نہ ملکیت۔ بلکہ وہ سب کی ساجھی مایا ہوتی ہیں۔ اور فرد بھی سوچتا ہے تو فرد کی حیثیت سے، کسی یک طرفہ رجحان کے تحت نہیں بلکہ جماعت کی روح میں ڈوب کر۔ گویا اس کا دل و دماغ ساری جماعت ہی کا دل و دماغ ہو جیسے سب کے احساس کی لہریں آپس میں گھل مل کر ایک ہو گئی ہوں اور ایک ہی دھارا بن کر بہتی چلی جائیں۔ ایسی کہانیاں ایسے معاشرہ میں ہی پیدا ہو سکتی ہیں جس میں ہر کس برائے خویشتن نہیں بلکہ برائے دیگراں ہو۔ ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔ اور یہ عوامی چیزیں۔ گیت، کہانیاں۔ دل کی گہرائیوں ہی سے بلند ہوتی ہیں۔ جیسے پاتال میں بہتے ہوئے پانی کی لہریں جن کی فطرت ہی میں ہم آہنگی ہے۔ یک دل، یک جان، یک آہنگ۔ یہی ان کی روح رواں اور مابہ الامتیاز ہے جو انہیں ایک جادوانی حیثیت عطا کرتا ہے۔ اور جوں جوں زندگی کی لہریں آگے بڑھتی جاتی ہیں وہ اپنے پُرزور بہاؤ میں ان کہانیوں کو بھی بڑھاتی چڑھاتی ساتھ لئے جاتی ہیں اور ان میں برابر نیا آب و رنگ پیدا کئے جاتی ہیں۔ اور دھرتی کے باسیوں کے گرم گرم خون کی لہریں بھی۔ اگر ہم غور سے سنیں تو ان سے زندگی کی دھڑکنیں صاف صاف سنائی دیں گی۔

ان وجوہ کی بناء پر اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے عوامی گیت، عوامی کہانیاں، ہماری زندگی کا حاصل، ہمارا عزیز ترین سرمایہ، ہمارا بیش بہا، غیر فانی ثقافتی ورثہ ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ کسی تکلف یا بناوٹ کی راہ سے ہم تک نہیں پہنچتیں بلکہ اپنی بیساختگی سے خود بخود دل میں گھر کر لیتی ہیں۔ یہ ہماری اپنی چیزیں ہیں۔ اسلئے ہم انہیں دل میں جگہ دیتے ہیں عمر بھر حرزِ جاں بنائے رکھتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے یہ ہمارے دل و دماغ پر چھائی رہتی ہیں۔ جیسے ان کے بغیر ہماری زندگی زندگی ہی نہ ہو۔ ایک ایسی زندگی جس میں کوئی خواب نہ ہو۔ سپاٹ، بے کیف، بے رنگ، بے سوز و گداز۔ اور ظاہر ہے کہ جہاں زندگی ہو وہاں زندگی کی قدریں بھی ہوں گی جنہیں ہم جان و دل سے عزیز رکھتے ہیں۔ اور اپنی حیات کو انہی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس سے قطع نظر یہ کہانیاں کسی قوم کی ذہانت، اس کی طباعی، اس کے فکر و خیال کی رنگینی و شادابی کی آئینہ دار اور اس کے حساس اور جاندار ہونے کی علامت بھی ہوتی ہیں۔ جتنی کسی قوم میں

سکت اور اس کے تقاضوں سے نبٹنے کی صلاحیت ہوگی، اتنی ہی اس کی حیات کی رواں دواں، افتاں و خیزاں موجیں چھلک چھلک کر کہانیوں کا روپ دھاریں گی۔ اپنے ماحول کی چھاپ لئے معاشرہ کے مدوجزر کی عکاسی کرتی ہوئی اور قدروں اور آدرشوں کی جھلکیاں لئے ہوئے۔

ہمارا ملک اس لحاظ سے کافی ممتاز ہے۔ اس کا دامن طرح طرح کی اچھوتی، دلچسپ عوامی کہانیوں کے گلہائے رنگ رنگ سے لبریز ہے۔ اور ایسے کہ "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"۔ مشرقی پاکستان کی اپنی ہی ایک فضا ہے۔ بڑی پیاری، نفیس، ہری بھری، مسحور کن۔ وہ ہے ہی سحر و افسوں کا دیار۔ جس میں آکاش پر اڑتے ہوئے دھواں دھار، کالے کالے، اودے اودے، نیلے نیلے بادل نیچے بے شمار چمکتی دمکتی، چنچل ندیوں سے آنکھ ملا کر ایک مستی بھرا البیلا ناچ ناچتے ہیں اور ساری دھرتی میں ایک خوشی اور جیالے پن کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہاں کی خوشگوار آب و ہوا اور زرخیز زمین نے بڑی ہی پیاری زندگی اور دھرتی کے رنگ رس میں بسی ہوئی عوامی کہانیاں پیدا کی ہیں۔ جن کے تار ایک بنیادی ہم آہنگی کے تحت بڑے اچھوتے اور پُراسرار پیرائے میں مغربی بازو کی عوامی کہانیوں سے ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسلئے کہ دونوں بازوؤں کا دل، ان کی روح، ان کی زندگی ایک ہی ہے۔

ادھر مغربی پاکستان کی دنیا بھی کس قدر زنگارنگ ہے۔ ہر خطہ ایک خاص وضع لئے ہوئے اور اس میں زندگی کی ایک انوکھی طرح، دوسروں سے ملتی جلتی بھی اور الگ بھی۔ وادئ مہران کے وسیع لق و دق ریگ زاروں پر نظر ڈالئے۔ کیسا ہو کا سماں ہے! اگر ان کی سنہری ریت میں کوئی سسی یعنی صحرا کا "چاند" نہیں پیدا ہوگی اور اسکی زندگی اس ریت ہی سے وابستہ نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا؟ "مور رڈ میر بحر" کے لئے کراچی کے کناروں سے زیادہ موزوں مقام کونسا ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے کراچی نے فلاچی سے نام نہ پایا ہو۔ لیکن کیا یہ بات دل کو نہیں لگتی؟ عوامی ذہن کچھ اسی طرح سوچتا ہے۔ نوری اور اس کے خاندان، گندری کے مچھیروں کی بستیاں سندھ کے ساحلوں پر نہیں ہوں گی تو اور کہاں ہوں گی؟ اور پھر سسی پنوں، سہتی مراد محض مہران اور بولان کی وادیوں ہی کے باسی نہیں رہے اور نہ ان کی کہانیاں ان ریگ زاروں اور جلے جھلسے پہاڑوں ہی کی کہانیاں رہی ہیں۔ بلکہ پنج ند کی اوپری سرزمین میں چلے جائیے تو آپ کو ان کا گھر گھر چرچا سنائی دے گا اور بڑی

بوڑھیاں رات دن ان کی پُر لطف کہانیاں سناتی دکھائی دیں گی۔ جس طرح دریائے سندھ مغربی پاکستان کے لئے ایک ہے اور ساری وادی درحقیقت مہران ہی کی وادی ہے۔ اسی طرح اس کا تہذیبی ورثہ بھی ایک ہی ہے۔ اس وادی کے سارے علاقوں میں کوئی فرق نہیں۔ نہ کوئی اونچا ہے نہ نیچا۔ بلکہ سرحد کا سنگلاخ علاقہ ہو یا پانچ دریاؤں کی سرزمین، سابق پنجاب کا لمبا چوڑا میدان ہو یا سندھ اور بلوچستان کے ریتیلے اور پہاڑی علاقے، سب کے سب یک رنگ و یک آہنگ ہیں۔ علاقۂ سندھ کا کونسا قصہ ہے جو وادیٔ سندھ کے بالائی حصوں میں نہ پہنچا ہو؟ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، مرزا صاحباں، سب کے سب ہر کہیں زبان زدِ عام ہیں۔ اور شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے جو وادیٔ مہران کی زبان بھی ہیں اور روح رواں بھی، اپنے "رسالو" کے کئی کئی سُر کئی کئی "داستانیں" انہی کے لئے وقف کردی ہیں۔ بلکہ بعض شاعروں نے تو یہ قصے فارسی میں بھی لکھے ہیں۔ خصوصاً "ہیر رانجھا" کا قصہ۔ گویا سندھ کی وادیٔ کبیر کے مختلف حصوں میں اس قسم کا ثقافتی لین دین برابر جاری رہا اور آج بھی جاری ہے۔ ہر حصے کے ہر دلعزیز عوامی قصے کہانیاں سب کے لئے یکساں دلچسپی کا باعث اور سب کا سانجھا اثاثہ ہیں۔ سب کے دلوں پر اِن کا یکساں جادو اور سب کے تخیل پر یکساں حکمرانی ہے۔

(سابق) پنجاب کے قصے کہانیاں جہاں اس کی فضا میں پوری طرح رسی بسی ہوئی ہیں وہاں ان کی زبان، ان کی وضع، وارداتیں، بھرپور اصلیت کا اثر چھوڑتی ہیں جس میں شاعری اور بھی کیف پیدا کرتی ہے۔ یہ محض قصے کہانیاں ہی نہیں بلکہ یہاں کی بڑی جاندار تاریخ بھی ہیں۔ اور یہاں کے لوگوں، ان کے مزاج، ان کے ماحول، عقائد، طور طریق، راہ و رسم وغیرہ کا مکمل نقشہ بھی ہیں جس سے افسانے میں ایک اور لطیف بُعد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

اور وہ جوانانِ سرحد کی دنیا — وہ بھی اپنا ہی ایک عالم رکھتی ہے۔ اسکے قصے کہانیاں بھی اتنے ہی فراواں ہیں جتنی خود اُن کی ہنگاموں سے لبریز زندگی کی وارداتیں اور افتادیں۔ ان میں سنگینی بھی ہے اور رنگینی بھی، رزم بھی اور بزم بھی۔ شاید بقول شخصے بوئے خوں آتی ہو اس قوم کے افسانوں سے لیکن اس کے ساتھ ہی ان سے خونِ دل کی بو بھی آتی ہے۔ خٹک ناچ کی طرح ان میں للکار کا شور و شر بھی ہے اور جشنِ طرب کی چہل پہل بھی۔ ایسی قبائلی زندگی جس میں عربوں کی طرح "مروۃ" کو خاص دخل ہو،

خود بخود طرح طرح کی افتادوں کو جنم دیتی ہے۔ اس لئے اس سے المیے اور طربیے خود بخود ابھرتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ ایک ساتھ جیسے یہاں کی سب سے دردناک کہانی "میمونئی" میں محبت بھی ہے اور ہیبت بھی۔ اور اس دوسرے عنصر ہی کی وجہ سے یہ کہانی اس مجموعہ میں شامل نہیں کی گئی۔ جس طرح اس شمالی علاقے کی دنیا حرب و ضرب کے ساتھ طرب کی دنیا بھی ہے۔ اسی طرح اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ "عشق خیزد از آب و ہوائے کشور ما" اور جہاں تلواروں کی جھنکاریں بلند ہوتی ہیں وہاں ٹپوں کے "یا قربان!" اور "روئی دئی" (طربیہ و المیہ دونوں صورتوں میں) کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اس لئے یہاں جتنے ہنگامے ہیں اتنی ہی کہانیاں بھی ہیں جن کا سلسلہ ہمارے اپنے زمانے تک پہنچتا ہے۔ یہ کہانیاں اسی طرح ہمارے لئے جیالے پن کا پیغام لاتی ہیں جس طرح خٹک ناچ اور ہماری زندگی اور تخیلی دنیا میں ایک نہایت اہم عنصر کا اضافہ کرتی ہیں۔ جس سے خود بخود قرب کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

ان عوامی کہانیوں کے خط و خال بھی مخصوص ہیں۔ ان میں ایک آزاد ذہن کام کرتا ہے جو ترقی یافتہ ذہن کی نفاستیں اور زین میکھ نہیں جانتا اسی لئے ان کہانیوں میں ایک قدرتی سچائی اور توانائی ہے۔ اور یہی ان کا سب سے بڑا جادو ہے۔

اس مجموعہ میں پاکستان بھر کی مشہور اور چیدہ چیدہ عوامی کہانیوں کو فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ہم پاکستانیوں کو اپنے اس پوشیدہ خزانے کا علم ہو اور ہم اسکی قدر کریں، ہمیں پاکستانی علاقوں کے باسیوں کی شوخیٔ تصوّر اور ذہانت کا اندازہ ہو اور ہم اُس بنیادی روح تک پہنچ جائیں جو سارے پاکستان اور پاکستانیوں میں قدرِ مشترک کے طور پر کام کرتی ہوئی وحدت و یگانگت کے احساس کو تقویت بہم پہنچاتی ہے۔

اس قسم کا ایک مجموعہ "پاکستان کی عوامی کہانیاں" کے نام سے چند سال ہوئے شائع کیا گیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب پاکستان ابھی قائم ہوا ہی تھا۔ اور ہمیں اپنے اس مایۂ ناز قومی سرمایہ کا چنداں علم نہیں ہوا تھا۔ یہ بجائے خود قیام پاکستان کا ایک معجزہ ہے کہ ہمیں اپنی علاقائی زبانوں، ان کے ادب، ان کے مشاہیر، ان کی روایات، ان کی تہذیب و ثقافت، ان کی تاریخ و آثار وغیرہ کو جاننے کا موقع ملا ہے۔ اب جب ہمارا قومی سال و سن کتنے ہی منازل طے کرچکا ہے، اس انمول خزانے کے متعلق ہماری معلومات

بدرجہا بڑھ چکی ہیں۔ اسلئے ہم اس مجموعہ میں پہلے سے کہیں زیادہ عوامی کہانیاں پیش کر رہے ہیں۔ تاکہ کثرت اور تنوع کے ساتھ ذوق و تفنن کی تسکین بھی ملحوظ رہے۔ ابتدائی مجموعے میں جو کہانیاں پیش کی گئی تھیں وہ زیادہ معروف کہانیاں تھیں جن کا تعارف نشری تقریروں کے ذریعہ سے کیا گیا تھا۔ اور اس طرح تاریخ، تحقیق اور افسانہ آپس میں آمیز ہو گئے تھے۔ یہ کہانیاں اس مجموعہ میں بھی شامل ہیں۔ دوسری کہانیوں میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ وہ صرف کہانیاں ہوں اور ان میں تعارف یا توضیح و تشریح کا عنصر شامل نہ ہو جو قصے کہانی کی روح کے منافی ہے۔ جہاں تک نشر شدہ کہانیوں کا تعلق ہے ہم ان کے لئے ریڈیو پاکستان کے ممنون ہیں۔

مجموعہ کی افادیت اور دلچسپی بڑھانے کے لئے یہ اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ اس میں مغربی پاکستان کی حد تک کاف تا کاف یعنی کراچی تا کشمیر کی عوامی کہانیاں بھی شامل ہوں بلکہ جن کہانیوں کے کچھ حصے یا ان سے متعلق نظمیں اردو میں آ چکی ہیں، ان کے برجستہ پارے ہر کہانی کے بعد پیش کر دئے جائیں جس سے نثر کے ساتھ نظم کا کیف بھی حاصل ہو سکے۔

وادئ لولاب اور کشمیر کی دو کہانیاں منظوم ہی لکھی گئیں اور اسی طرح ہی پیش کی جا رہی ہیں۔ اپنے ملک کے علاقائی شہ پاروں کو اردو نظم میں منتقل کرنے اور اس خوش اسلوبی سے کہ وہ اس ہی کا حصہ معلوم ہوں، ہمارے شاعروں نے بڑا کام کیا ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ جب اردو کے اس نئے سرمایہ کا جائزہ لیا جائے تو وہ بجائے خود ایک قابل قدر تخلیقی کارنامہ ثابت ہو جس میں ہمارے ادب و فکر کو متأثر کرنے، ان کا رخ بدلنے اور نئی جولاں گاہیں مہیا کرنے کے وسیع امکانات ہیں۔

یہاں ان کہانیوں کے متعلق فرداً فرداً کچھ کہنے کا موقع نہیں۔ ان میں عام بیانیہ پیرائے کے علاوہ پیشکش کے بعض اچھوتے طریقے بھی اختیار کئے گئے ہیں۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ اور یہ بتاتے ہیں کہ اگر ہمارے یہاں قصے کہانیوں کی افراط ہے تو عمدہ قصہ گویوں کی بھی کمی نہیں۔ ہم زیادہ دیر ان کہانیوں اور قارئین کے مابین حائل نہیں ہونا چاہتے اور عوام کی چیز عوام ہی کی نذر کرتے ہیں۔

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

رفیق خاور

اٹک کے اُس پار:

موسیٰ خاں گل مکئی

آدم درخانئی

محبوبہ جلات

یوسف کڑہ مار

شہہ تور دِلئی

زرسانگہ

بہرام وگل اندام (منظوم)

موسیٰ خاں گل مکئی

حافظ محمد ادریس

موسیٰ خاں اور گل مکئی کی کہانی کو پشتو کے مشہور شاعر ملا نعمت اللہ مرحوم نے منظوم کر کے اس پر دوام کی مہر ثبت کر دی ہے۔ کہانی کا تعلق یوسف زئی پٹھانوں کی روایات سے ہے۔ جو پٹھانوں کا ایک مشہور قبیلہ ہے۔ اور جن کی آبادی زیادہ تر مردان اور صوابی کے علاقہ میں ہے۔

ایک تھا بادشاہ۔ اس کا نام تھا عیسٰی خاں۔ وہ قبیلہ یوسف زئی کا سردار تھا۔ اس کی حکومت ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس کے پایۂ تخت کا نام توا ترین تھا جس کے خرابہ پر آج کل تحصیل صوابی ضلع مردان میں عزومبک نامی گاؤں آباد ہے۔ عیسٰی خاں کے پاس خدا کا دیا ہوا سب کچھ تھا۔ مگر اولاد کی دولت سے محروم تھا۔ اس زمانہ میں شیخ رحمکار رحمتہ اللہ علیہ المعروف بہ کاکا صاحبؒ ایک مشہور بزرگ تھے۔ جن کی عقیدت کا دم سب لوگ بھرتے تھے۔ اور ایک عالم اُن کی بارگاہ سے اپنی حاجتیں پوری کراتا تھا۔ عیسٰی خاں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اولاد کے لئے دعا کی التجا کی۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مرید با صفا حضرت شیخ کے لئے انجیر کے دانے لے آیا۔ حضرت شیخ نے عیسٰی خاں کی طرف بڑھائے۔ اس نے صرف دو دانے اٹھا لئے۔ اور کہا حضور گرمی کا موسم ہے۔ میرے لئے یہی دو دانے کافی ہیں۔ حضرت شیخ نے فرمایا۔ جاؤ۔ دو اُٹھا لئے تو دو ہی سہی۔ دعا مستجاب ہوئی۔ اور تھوڑے عرصہ میں عیسٰی خان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام موسیٰ خاں رکھا گیا۔

جب شاہ دوراں خان عیسٰی خاں کا ولی عہد شہزادہ موسیٰ خاں اس قابل ہوا کہ اسے تعلیم دلوائی جائے۔ تو گو اپنی حکومت میں علما کی کمی نہ تھی۔ لیکن شہزادہ کی تعلیم کے لئے کسی ایسے استاد کی ضرورت تھی جو اپنے وقت کا امام رازی یا کم از کم ابن جوزی ضرور ہو۔ عیسٰی خاں کی حکومت کی سرحد پر ایک دوسرا بادشاہ حکمراں تھا۔ جس کے دارالحکومت کا نام سپین ترین تھا۔ وہاں ایک بزرگ عالمِ دین کا قیام تھا جس کے حلقۂ درس سے فیض پانے کے لئے دور دور سے شاگرد آتے تھے۔ اس کی درسگاہ میں لڑکے اور لڑکیاں باہم مل کر درس لیتے تھے۔ اور اس گنجینۂ علم و معرفت سے یکساں طور پر سیراب ہوتے تھے۔ چنانچہ شہزادے کو اسی عالم کے پاس پڑھنے کے لئے بھیجا گیا۔ وہ روزانہ صبح سویرے سبق پڑھنے کے لئے سپین ترین چلے جاتے اور دوپہر کو اپنے گھر واپس آجاتے۔

گھبرائیے نہیں یہ کہانی ہے اور جنگ و عشق کی طرح کہانی میں بھی سب کچھ جائز ہے۔ دراصل آپ کو شاہ دوراں، شہزادہ، ولیعہد اور پایۂ تخت وغیرہ کے شاندار الفاظ نے ڈرا دیا ہوگا۔ بات یہ ہے کہ پرانے زمانے میں ہمارے ہاں جو شخص بھی اپنے ڈیرے کا مالک ہوتا۔ اور اس میں دو تین ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں اور ایک میلا کچیلا حقہ رکھ سکتا۔ وہ کہانی میں جاکر شہنشاہِ کشورستاں بن جاتا۔

مولانا کے درس میں جہاں بیسیوں شاگرد اور شاگردنیاں ہوتی تھیں وہاں اسی گاؤں کے بادشاہ، شاہ مست خاں کی صاحبزادی گل مکئی بھی آکر شامل ہوتی تھی۔ اور دوسرے شاگردوں سے نسبتاً ممتاز جگہ پر بیٹھتی تھی۔ سبق اور کھیل ہی کھیل میں موسیٰ خان اور گل مکئی ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ اور چپکے چپکے دلوں کا سودا طے ہوگیا۔

عشق اور وہ بھی بچپن کا عشق۔ یہ آگ بھلا کہیں چھپائے چھپ سکتی ہے۔ ہم مکتبوں میں دونوں کے عشق و محبت کے چرچے شروع ہوئے۔ بات آہستہ آہستہ درسگاہ سے باہر نکل گئی۔ اور سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ جب گل مکئی کی والدہ کو معلوم ہوا کہ لوگ اس کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلاتے ہیں۔ تو اس نے بچی کو مدرسے سے اٹھا لیا۔ اور

خاندانی رواج کے مطابق اُسے پردے میں بٹھا دیا۔ عشق کی تکمیل شاید اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اسے خاردار جھاڑیوں میں سے گذارا جائے۔ گل مکئی پردے میں کیا بیٹھی کہ موسیٰ خاں کی قسمت کا ستارہ غروب ہو گیا۔ اب وہ روزانہ پڑھنے کے لئے مکتب آتا۔ مگر اس کی نظریں جن نقوش کی متلاشی تھیں۔ وہ کتاب میں نہیں مل سکتے تھے۔ گو مصحفِ الٰہی اس کے سامنے پڑا رہتا۔ مگر جیسا کہ آزمودہ کار بزرگوں نے کہا ہے۔ مجاز حقیقت کا پُل ہے۔ وہ اس حقیقت تک مجاز کے پُل کے ذریعے پہنچنا چاہتا تھا۔ اور یہ پُل اس کی بدقسمتی سے ٹوٹ چکا تھا۔

اس نے گل مکئی کا رُخِ انور دیکھنے کے لئے بہتیرے جتن کئے۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ گل مکئی پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کی گئی تھیں کہ وہ گھر کے دروازے تک بھی نہیں آسکتی تھی۔ آخر کار اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ مکتب کے پاس ہی ایک بڑھیا کا مکان تھا۔ جسے گاؤں بھر کے بچے نانی اماں کہتے تھے۔ موسیٰ خاں نے اس سے مراسم بڑھائے۔ کچھ تحفے تحائف پیش کئے، اور پھر اپنے عشق کی داستان سُنا کر بڑھیا سے امداد کی التجا کی۔

افسانوی دنیا میں بڑھیوں سے اور کوئی کام ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ نامہ و پیام کے لئے بڑی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ بڑی بی نے اس اہم کام کا بیڑا اٹھایا۔ اور پیام رسانی پر رضامند ہو گئی۔ گل مکئی نے بھی موسیٰ خاں کے نیاز نامے کا جواب محبت نامے سے دیا۔ اور نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ گو دونوں ملاقات سے محروم تھے۔ عشق میں کامیابی کی پہلی سیڑھی رازداری ہے۔ مگر یہ بیماری کچھ اس قسم کی ہے کہ انسان جب تک اپنی داستان دوسروں پر افشا نہ کر لے چین سے بیٹھ نہیں سکتا۔ اور دوسروں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے جہاں کہیں موقع پاتا ہے اپنی واردات الف سے لے کر ی تک سناتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ خاں نے بھی گل مکئی کے خطوط دوستوں کو سُنانے شروع کئے اور آج کل کے دوست تو خیر جیسے بھی ہیں۔ لیکن اس زمانہ کے دوستوں کی حالت سے تو آپ بخوبی واقف ہیں۔ ایک دن کسی نے موقع پا کر گل مکئی کا ایک خط اڑا لیا۔ اور لے جا کر سیدھا اس کے باپ شاہ مست خاں کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ شاہ مست خاں نے دیکھا تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میری بیٹی اور اغیار سے راز و نیاز! بخدا اس توہین کو

برداشت کیا جا سکتا۔ پہلے تو اس نے گھر جا کر بیوی اور بیٹی کی خوب خبر لی۔ پھر لوگوں کو جمع کر کے فیصلہ کیا کہ رات کے پردے میں سپین ترین پر دھاوا بول دیا جائے۔ اور اس سے گاؤں کی بے حرمتی کا بدلہ لیا جائے۔ فوراً ڈھنڈورا پٹوایا گیا۔ اور جو شخص بھی ہتھیار اٹھانے کے قابل تھا وہ گاؤں کے مرکزی مقام پر پہنچ گیا، اور چند لمحوں میں اچھا خاصا لشکر جمع ہو گیا۔ ادھر عیسیٰ خاں کو معلوم ہوا کہ سپین ترین والے شبخون کے لیے آ رہے ہیں۔ تو اس نے بھی اپنا لشکر آراستہ کیا۔ دونوں لشکر میدان میں نکل آئے۔ قبائلی عصبیت کے نام پر خون ریزی شروع ہوئی۔ تھوڑی دیر میں طرفین کے کئی آدمی مارے گئے اور کئی زخمی ہوئے۔ علما اور مشائخ نے سنا تو وہ قرآن مجید سروں پر اٹھا کر آ گئے۔ اور خدا اور رسول کے واسطے دے دے کر بیچ بچاؤ کرا دیا اور اس طرح ان کی برکت سے خوں ریزی کا سلسلہ پھیلنے سے رک گیا۔ اس واقعہ کو کافی عرصہ گزر گیا۔ ایک دن موسیٰ خاں کا ملازم شاہ ست خاں کے علاقہ میں گائیں چرانے کے لئے چلا گیا۔ اتفاق سے اس کا بھتیجا سہیل خاں بھی شکار کے لئے نکل آیا تھا۔ سہیل خاں گل مکئی کا منگیتر تھا۔ اس لئے وہ توا ترین کے ہر آدمی کو اپنا رقیب سمجھتا۔ سہیل خاں نے برا بھلا کہہ کر گوالے کو وہاں سے نکال دیا۔ اس نے آ کر موسیٰ خاں سے شکایت کی۔ موسیٰ خاں اپنے رقیب کے ہاتھوں اپنے ملازم کی توہین کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ فوراً تلوار اٹھائی اور چراگاہ میں پہنچ کر سہیل خان کو مقابلہ کے لئے للکارا۔ سہیل خاں نے بپھرے ہوئے شیر کو آتے دیکھا تو فوراً نرم پڑ گیا۔ اور کہنے لگا بھئی بات یہ ہے کہ یہاں گاؤں کی دوشیزائیں بھیڑ بکریاں چرانے کے لئے آتی ہیں۔ اس لئے میں نے کسی غیر مرد کا آنا مناسب نہ سمجھا۔ ورنہ بھلا میری یہ مجال ہو سکتی تھی کہ کوئی ایسی حرکت کرتا۔ جو آپ کو ناگوار خاطر ہوتی۔ یہ سن کر موسیٰ خاں کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ نرم فقروں نے آگ پر پانی کا کام دیا۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے، اور دوستی کا وعدہ کر کے ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ لیکن بھلا جہاں عورت یا قصاص کا ہاتھ ہو، وہاں دوستی کیوں کر ہو سکتی ہے؟ البتہ اس طرح ایک ہوشیار دشمن دوستی کے پردے میں اپنے رقیب سے مطلب برآری ضرور کر سکتا ہے۔ سہیل چاہتا

تھا کہ موقع پا کر موسیٰ خاں کا کانٹا سامنے سے دور کر دے۔ اور موسیٰ خاں کا خیال تھا کہ آمد و رفت کے لئے رستہ بنا کر گل مکئی کو اڑا لے جائے۔

کچھ عرصہ کے بعد سہیل کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ موسیٰ خاں کو بھی دعوت دی گئی اور یہ تجویز ہوئی کہ جب بندوقوں کی فائرنگ ہو تو موسیٰ خاں کو گولی کا نشانہ بنا دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ خوں بہا دینا پڑے گا، دے دیا جائے گا۔ عشا کے وقت سب مہمان حجرے میں جمع تھے۔ ناچ گانے کی محفل جمی ہوئی تھی۔ اتنے میں ایک چھوٹے بچے نے آکر موسیٰ خاں کے کان میں کچھ کہا۔ موسیٰ خاں موقع پا کر چپکے سے باہر نکل گیا۔ مکان کے پچھواڑے باغ تھا۔ جہاں گل مکئی کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہاں انگور کی بیل کے سایہ میں مدت کے بچھڑے ہوئے دو دل ایک دوسرے سے ملے۔ گل مکئی نے التجا کی کہ انہیں راتوں رات علاقہ سے دور کہیں نکل جانا چاہیے۔ موسیٰ خاں بھی راضی ہو گیا۔ اور یہ دونوں درختوں کی آڑ میں چھپتے چھپاتے گاؤں سے باہر نکل گئے۔ ابھی تھوڑی دور گئے تھے کہ گھر میں دلہن کی ڈھنڈیا مچ گئی۔ سہیل خاں نے سنا تو اس کو فوراً موسیٰ خاں کا خیال آیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ موسیٰ خاں بھی غائب ہے۔ چاروں طرف آدمی دوڑائے گئے۔ اور آخر کار سہیل خاں نے ان کو جا لیا۔ موسیٰ خاں اس کے ساتھ خود مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن گل مکئی نے نہ مانا۔ خود مردانہ وار آگے بڑھی اور اس پر تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ سہیل وہیں جاں بحق تسلیم ہوا، اور گل مکئی موسیٰ خاں کی رفاقت میں تواتر ین پہنچ گئی۔

آدم درخانئ

رضا ھمدانی

سوات کی فراخ وجوان وادی، سرسبز وشاداب چراگاہیں، اور نرگسوں سے معمور کھیت، آدم خاں کے ملکوتی نغموں میں ڈوبے ہوئے کھوئے ہوئے کسی جنت گم گشتہ کے حصے معلوم ہوتے۔ جب آدم خاں کی راگ بھری انگلیاں رباب کے تاروں سے مس ہوتیں تو ساکت وخاموش تاروں میں جیسے ہزاروں حوریں گانے لگتیں، سینکڑوں کوئلیں اور پپیہے ہجر و فراق کی داستانیں سنا سنا کر نرگستانوں میں آگ لگا دیتے جس سے سوات کی چراگاہیں افسردہ ہو جاتیں اور شاداب وادیوں کی جوانی جھلس کے رہ جاتی۔ پنگھٹ پہ جاتی ہوئی الھڑ دوشیزائیں راستہ چلنا بھول جاتیں، ان کے قدم رک رک جاتے، اور اکثر کے سروں اور کولھوں پر رکھے ہوئے پانی کے گھڑے زمین پر گر کر ان کے ارمانوں کی طرح چور چور ہو جاتے۔ ان کی رگ رگ میں رومانی ٹپوں کا الاپ گدگدی کرنے لگتا، ان کی امنگیں زخمی پنچھیوں کی طرح "رقصِ بسمل" میں مگن ہو جاتیں۔

آدم خاں کے رس بھرے نغموں کے ساتھ اس کی بھرپور جوانی اور صدف ایسی آنکھوں کی چمک دمک، کھلتا ہوا گندمی رنگ، کتابی چہرے کے دلکش نقوش اور شمشاد ایسے قد کی رعنائی کا شہرہ "بازہ درہ بالا" کی حدود سے نکل کر سارے سوات میں پھیل چکا تھا۔ یہ سارا سوات اس گاؤں کی قسمت پر رشک کرنے لگا

لوگ کہتے:۔

"حسن خاں ملک کتنا خوش نصیب ہے کہ اللہ نے اسے مال و دولت کے ساتھ ساتھ آدم خاں ایسا بیٹا بھی عطا کیا ہے۔ قبیلے کی آنکھ کا تارا!"

آدم خاں، گاؤں کی ہر لڑکی کا محبوب۔ سینکڑوں کنواریوں کے دل اس کے رباب کے تاروں میں الجھے رہتے۔ لیکن آدم کو کسی سے بھی عشق نہ تھا۔ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ اسے اگر عشق تھا تو اپنے رباب سے وہ رباب کے تاروں کے ساتھ باتیں کرتا، نئی نئی باتیں، انوکھے انوکھے راز و نیاز، اس کی انگلیاں ہر لمحہ تاروں کے ساتھ کھیلتی رہتیں اس کی آواز ہر وقت کسی ابدی نغمے کے سراغ میں بھٹکتی رہتی۔ وہ آنکھیں بند کئے ہر وقت نغمے کے پُر شور سمندر میں چلا جاتا، اپنی منزل متعین کئے بغیر کشتی، ساحل اور ناخدا سے بے نیاز ایسی جل پری کی تلاش میں جو نغمے سے زیادہ دلکش اور زہرہ و مشتری سے زیادہ حسین و جمیل ہو۔ اس کے ذہن و تخیل پر ایک ایسی تصویر مرتسم ہو چکی تھی جسے وہ اپنے دل کی ملکہ بنانا چاہتا تھا۔ یہ راز اس کے دل میں کے جھلے میں پل رہا تھا، وہ اپنے دل کی بات کس سے کہتا؟ اسے کوئی راز دار نہ ملتا تھا، وہ ہر لمحہ اس تخیلی پیکر کو نغموں کے خواب زاروں میں محوِ گلگشت دیکھتا، اسے خواب میں بھی اسی کا خیال آتا۔

ماں باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر جیتے۔ وہ اس کی شہرت اور تعریف سن کر اللہ کا شکر بجا لاتے۔ اب ان کے دل میں ایک آرزو تھی۔ آدم خاں کی شادی۔ لیکن آدم خاں کی شادی اس پیکر تخیل کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ ناممکن تھی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ ماں باپ کو سخت صدمہ ہوا، وہ آدم خاں کے انکار کے پس منظر سے بے خبر تھے۔ انہیں آدم کے خیالی عشق کی خبر نہ تھی، اور جب آدم کے دو راز دار دوستوں نے انہیں اس راز سے آگاہ کیا کہ وہ تو اپنے خوابوں کی ملکہ کے ساتھ ہی شادی کرے گا تو انہوں نے اس کو بڑے تعجب سے سنا۔

وہ سمجھے شاید آدم کو رباب نوازی کے بے پناہ شوق نے پاگل بنا دیا ہے۔

ایک دن جب آدم خان رباب کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف تھا تو اس کے کانوں میں کچھ ایسی آوازیں پڑیں جیسے کسی نے رس گھول دیا ہو۔ جب وہ ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔ پڑوس کے گاؤں "بازدرۂ پایاں" سے آئی ہوئی مہمان بڑھیا اپنے گاؤں کی ایک لڑکی کا ذکر کر رہی تھی۔ وہ طاؤس خاں کی اکلوتی مہ جبین لڑکی "درخانئی" کے حسن و جمال کی تفسیر میں محو تھی، آدم خاں کو دیارِ محبوب سے آئی ہوئی ہستی سے ایک گونہ انس پیدا ہو گیا، اسے یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ تمام باتیں اسی کی محبوبہ کی ہو سکتی ہیں۔ اور آدم نے بڑھیا کے سامنے "درخانئی" کے خد و خال بیان کرنا شروع کئے۔ جب اس نے بائیں رخسار کے تل اور پیشانی کے دلکش نشان زخم کا پتہ دیا تو بڑھیا نے قسم کھا کر کہا: "آدم بیٹا! تم نے درخانئی کو ضرور دیکھا ہے" لیکن آدم نے کہا: "خالہ میرا خواب سچا ہے میری محبت ازلی و ابدی ہے۔ میرا عشق پاکیزہ ہے"۔

بڑھیا نے آہ سرد کھینچ کر کہا "لیکن بیٹا! یہ سب کچھ بے سود ہے۔ درخانئی کی منگنی تو ایک خان پایاؤ کے ساتھ ہو چکی ہے۔ بڑھیا کے ان الفاظ نے آدم کی دنیا تہ و بالا کر دی، اس پر دیوانگی نے اپنا سایہ ڈال دیا۔ رباب کے ساتھ اس کا انس بڑھ گیا۔ اب تو اس نے رباب کے تاروں کو زبان دے دی تھی!

کہتے ہیں عشق کی آگ دونوں طرف سلگتی ہے۔ بڑھیا واپس اپنے گاؤں گئی تو اسے درخانئی سے آدم کے خوابوں اور اس کی بے پناہ محبت و شیفتگی کا ذکر کیا۔ اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب درخانئی نے بھی جواباً بڑھیا کے سامنے اپنے خواب بیان کئے۔ آدم خاں کی شکل و صورت بتائی۔ اور اس کے رباب کے آتش ریز نغموں کا ذکر کیا۔

درخانئی ہر رات خوابوں کی سرسبز و شاداب وادی میں آدم کو کسی ندی کے کنارے رباب بدست دیکھتی۔ اور جب رباب کے نغمات اپنے عروج پر ہوتے تو

درخانئ کسی اپسرا کی طرح آسمانی ناچ ناچتی ہوئی رباب کے ملکوتی نغموں میں گھل جاتی، اور جب آدم خاں رباب کے تاروں سے مضراب الگ کر لیتا۔ تو درخانئ اس میٹھے اور بہشتی خواب سے ایک دم بیدار ہو جاتی اور پھر اس کے کانوں میں آدم کے ٹپوں کا الاپ اور نغمے پہروں گونجتے رہتے۔

جب آدم خاں کو درخانئ کی محبت کا علم ہوا تو اس کے سمندِ شوق پر تازیانہ لگا۔ وہ وارفتگی کے عالم میں ہر لمحہ رباب بدست رہنے لگا۔ بڑھیا نے درخانئ کا پیغام محبت اور پھولوں کا تحفہ آدم خاں کو دیا، اور یہ خوشخبری بھی سنائی کہ وہ عنقریب ایک شادی کی تقریب میں یہاں آنے والی ہے۔

اور پھر شادی کی تقریب پر آدم نے اپنے فن نہیں بلکہ اپنے پرخلوص عشق، اپنے شوق و محبت اور سوز و گداز کا مظاہرہ کیا۔ ساری محفل پر جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ آدم و درخانئ کے خلوص و محبت کا جادو! —— اور جب درخانئ پر آدم کی نظر پڑی تو اس کے خواب و خیال کی شہزادی عالم ہوش و بیداری میں اور بھی نکھری ہوئی معلوم ہوئی۔ آدم کے جذبات شوق نے رباب کے تاروں میں جان ڈال دی —— اور اس نے محبوب کا گیت محبوب کے حضور میں بصد شوق و نیاز پیش کیا۔

درخانئ کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد آدم کی حالت روز بروز غیر ہوتی گئی۔ اب اس کا علاج درخانئ کے پاس ہی تھا۔ اس کے راز دار دوستوں، تھرو اور بالو سے اپنے دوست کی یہ حالت نہ دیکھی جا سکی۔ اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح آدم کو دیارِ محبوب میں پہنچا دیا۔ پھر ایک رات۔ تاروں بھری رات میں۔ محبت کے یہ دو پیکر اکٹھے ہوئے، دونوں نے ایک دوسرے کا استقبال آنسوؤں کے موتیوں اور اشکوں کے ہاروں سے کیا، ٹھنڈی آہوں کے گیتوں سے ایک نے دوسرے کو خوش آمدید کہی اور ایک لمحے تک دونوں کی خاموشی نے ایک دوسرے کو خراج محبت پیش کیا جب آہوں کے بادل چھٹے، اشکوں کا مینہ تھما تو عشق و محبت کے یہ دونوں افق مسکرائے:-

"میرے خوابوں کی شہزادی! تو آخر کب تک میرے خیالوں کی طرح آوارہ پھرتی رہے گی؟ آ نغموں کی طرح میرے رباب کے تاروں میں ڈھل جا! مضراب کی طرح میری انگلیوں کے پوروں میں پیوست ہو جا! اب جدائی برداشت نہیں ہو سکتی؟"

"میرے مغنی محبوب! میں تیرے نغموں کی دنیا میں کھو جانے کے لئے بیتاب ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں؛ رباب اور نغمے کی طرح، مضراب اور تاروں کی طرح، ــــ اے میرے چاند! دنیا میرے لئے تاریک رات کی مانند ہے میں چکور کی طرح تجھے ہر طرف تلاش کرتی رہتی ہوں۔ لیکن ہر قدم پہ دام بکھرے ہوئے ہیں۔"

"لیکن درخو پیاری! تیری منگنی؟ تیرا بیاہ؟ کیا مجھ سے میرا رباب چھین لیا جائے گا؟ میرا گلا گھونٹ کر میرے ٹپوں اور لالپوں کو موت کی نیند سلا دیا جائے گا؟ کیا میرے نغمے بے سوز کر دیے جائیں گے؟ کیا میرا رباب جلاہے کے حوالے کر دیا جائے گا؟ کیا یہ سچ ہے درخانئ؟ پیاری درخو؟"

میرے مغنی محبوب! سُریلے نغمے گانے بند کر دے، کیا تجھے اپنے رباب پر اعتماد نہیں رہا؟ رباب کے ساتھ تمہارے پاس بندوق بھی تو ہے۔ جب مضراب سے کام نہ چل سکے تو اس کی جگہ کارتوس لے لیتے ہیں یہی ایک یوسف زئی پٹھان کی جرأت و ہمت کا تقاضا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے ہیں۔ مجھے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ رباب ٹوٹ سکتا ہے لیکن اناڑی انگلیوں سے سر نہیں کیا جا سکتا۔"

ستاروں کی گردش نے ہوا کے جھونکے کی طرح تاروں بھری رات کے رومان کو درہم برہم کر دیا! دو دلوں نے ابھی راز و نیاز ختم بھی نہ کئے تھے کہ مرغ سحر نے اذان دی۔ درخانئ کے گھر کے صحن میں بندھی ہوئی بھیڑوں نے ممیانا شروع کر دیا اور یہ دونوں متوالے ایک دم جیسے گہری نیند سے چونک اٹھے۔ درخانئ کے دل سے بھیڑوں کے لئے بددعا نکلی:۔

"اے میرے باپ کی بھیڑو! تمہارے گلے میں ناسور پڑ جائے تم نے میرے محبوب کو

مجھ سے جدا کر دیا!"

دونوں نے آپس میں انگوٹھیوں کا تبادلہ کیا اور چاند سورج کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہو گئے!

اب تو یہ آگ دونوں طرف بھڑک اٹھی تھی، اس کے شعلے آسمان گیر ہو چکے تھے۔ درخانئی جیسے بیمار پڑ کر چارپائی پر پڑ گئی اس کا خیال تھا شاید اس طرح شادی کی بلا ٹل جائے گی لیکن بڑی بوڑھیوں کا خیال تھا کہ شادی ہونے سے درخانئی صحت یاب ہو جائیگی۔ اس طرح جس تیر سے اس نے شکار کرنا چاہا تھا وہ اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ ڈھول اور سرنا کی چیخم دھاڑیں درخانئی کی ڈولی دوشیزگی کی لاش اور جوانی کا ٹپرارمان جنازہ تھا۔ وہ پرکٹی کونج اور زخمی مرغابی کی طرح ڈولی میں پڑی کراہ رہی تھی۔

نئے قفس میں جا کر وہ سچ مچ بیمار پڑ گئی۔ اور نادان طبیبوں نے سمجھا کہ اسے تپ دق ہو گئی ہے۔ درخانئی خوب جانتی تھی کہ یہ روگ دوا دارو سے نہیں ٹلے گا۔ وہ دل ہی دل میں طبیبوں کی عقل پر ہنستی اور کہتی: "ٹھیک ہی تو کہتے ہیں طبیب۔ تپ دق ہی تو ہے، لیکن عشق کی تپ دق جس کا علاج ان کے بس کی بات نہیں۔ اور جب علاج معالجے نے کوئی اثر نہ کیا تو اسے میکے واپس بھیج دیا گیا۔

"درخانئی رقیب کے گھر جا چکی ہے"۔ اس خبر نے آدم کے ہوش و حواس کو برہم کر کے دیوانگی کی آغوش میں دے دیا تھا۔ اس کا رباب چھین گیا تھا، اس کا مضراب چرا لیا گیا تھا، اس کی غیرت پر حملہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے جذبات کو بری طرح جھنجوڑا گیا تھا۔

"درخانئی سخت بیمار ہو کر میکے واپس آ گئی ہے۔ وہ چند گھڑیوں کی مہمان ہے"!

اس دوسری خبر نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ آدم خاں کا بدنصیب باپ بیٹے کی حالتِ زار پر رات دن کڑھتا۔ آخر اس نے اپنے ایک قریبی دوست میرمائی کے ساتھ مشورہ کیا اور طے پایا کہ درخانئی کو زبردستی حاصل کیا جائے۔ میرمائی

اور حسن خاں نے ایک مسلح جمعیت کے ساتھ طاؤس خاں کے مکان پر حملہ کر دیا۔ بڑے کشت و خون کے ساتھ تدبیر کارگر ہوئی۔ اور آدم کو گوہر مراد ہاتھ آ گیا۔ لیکن تقدیر کھڑی مسکرا رہی تھی، اسے کچھ اور ہی منظور تھا، وہ نہیں چاہتی تھی کہ دو دل مل بیٹھیں

جب طاؤس اور پایاؤں نے مال و زر کا جال پھیلانا شروع کر دیا اور میر ہائی باوجود امیر و زردار ہونے کے مایا کے جال میں پھنس گیا تو اس نے سال ہا سال کی دوستی کو دولت پر قربان کر دیا، اس نے گویا آدم خاں کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر ڈالا اور اس طرح درخانئی پھر واپس اسی رنگین قفس میں قید ہو گئی، اس کی بیماری بڑھ گئی، وہ ہر لمحہ آنسوؤں کے شیش محل بناتی جو دوسرے لمحے چکنا چور ہو جاتے لیکن ان کے ٹوٹنے کی آواز کوئی بھی نہ سنتا!

آدم خاں کا رباب گم گشتہ ملنے کے بعد پھر کھو گیا، اور رباب اس کی تلاش بے سود تھی۔ اگر وہ دوبارہ مل بھی جاتا تو محبت کی کوئیل کو ذبح کرنے کے بعد اس کے گیت سننے کی کوشش افسردہ راکھ سے شعلۂ جوالہ کی تلاش کے مترادف تھی لیکن آدم خاں کے ساتھی میرو اور بالو نے رباب گم گشتہ کو پھر تلاش کرنے کی ٹھانی، انہیں آدم کی زندگی بڑی عزیز تھی، انہیں اعتماد تھا کہ درخانئی، آدم کے آغوش میں ضرور آ جائے گی۔ اور اس طرح آدم کا ساکت و خاموش رباب ایک بار پھر سوات کے نرگستانوں کو ملکوتی داستانیں سنائے گا، شاداب چراگاہوں میں پھر سے سحر نغمہ راج کرے گا، ندیوں کی گنگناتی ہوئی روانی تھم جائے گی۔ اور ترنم ریز چکور اور دراج رباب کے تاروں کے دام میں اسیر ہو جائیں گے۔

دوسرے دن میرو، بالو اور آدم خاں ملنگوں کا روپ دھارے دیار محبوب میں جا پہنچے۔ گاؤں کے باہر شہید کے مزار پر سارے د صوفی رما کر بیٹھ گئے۔ آن کی آن میں نئے درویشوں کی خبر جنگل کی آگ بن کر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ مزار پر ایک میلہ سا لگ گیا۔ بسیلیوں نامرادوں اور حاجتمندوں نے درویشوں سے دعائیں کرائیں، تعویذ گنڈے لئے اور

نامرادِ محبت آدم خاں نے سب کے لئے دعائیں کیں، ہر ایک کی ڈھارس بندھائی، لیکن اس کے اپنے آنسوؤں کے تار کوئی روکنے والا نہ تھا! اس کی ڈھارس بندھانے والا کوئی نہ تھا! اسے کسی نے ایسا عمل نہ بتایا جس سے اس کی محبت کا خاموش رباب چہک اٹھتا، لیکن اس کی رازدار بڑھیا نے اسے تسلی دی: "آدم خاں! پختون ہو، جوان، ہمت سے کام لو، درخانئی تمہاری ہی ہے، وہ ضرور تمہیں ملے گی!"

درویشوں اور ملنگوں کی آمد اور کرامات کا شہرہ طاؤس خاں تک بھی پہنچا۔ بڑھیا نے طاؤس خاں سے کہا: "خان! خدا اور اس کے درویشوں کے پاس بہت کچھ ہے۔ کہتے ہیں یہ درویش بڑے پہنچے ہوئے ہیں! شاید اُن کی دعا سے ہماری پھولوں کی ڈالی جیسی بچی پر اللہ رحم کر دے وہ تو مردوں کو زندہ کر دیتا ہے!"

جب طاؤس خاں راضی ہو گیا تو بڑھیا نے درخانئی کو خوشخبری سنائی: "بیٹا! تمہارے اور دل سے گرا ہوا گلاب کا پھول ابھی تمہارے ہاتھ آنا چاہتا ہے۔ اسے ہوشیاری سے اپنے بالوں میں سنوار لینا۔ بڑے زور کی آندھی چل رہی ہے۔ اب کے یہ پھول گر گیا تو آئندہ کبھی اس کی ایک پتی بھی نہ پا سکو گی!"

دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ آدم خاں ہزاروں عقیدتیں لئے در محبوب کی طرف روانہ ہو گیا، اس وقت اس کا انگ انگ نغموں بھرا رباب بنا محبت کے گیت الاپ رہا تھا، وہ سبزے کو روندتا پھولوں کو مسلتا، جھومتا، منزلِ شوق طے کر کے درخانئی کے سامنے جا پہنچا!

درخانئی، نرگستان سوات کی نرگسِ بیمار، پژمردہ کلی، کملایا ہوا پھول، خزاں گزیدہ پتی، مرجھائی ہوئی ڈال، بستر پر پڑی تھی! جب دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو انہوں نے ایک دوسرے کو آنسوؤں کے ہیروں کا ہدیہ پیش کیا، محبت کے چمکتے ہوئے ہیرے، پیار کے آبگینے اور ان آنسوؤں نے خموشی میں ایک دوسرے کو ہزاروں داستانیں سنا ڈالیں! درخانئی کی پھول ایسی جوانی آدم خاں کی روح

یں کانٹا بن کر پیوست ہو گئی، اس کے دل میں ایک تیر لگا۔ معاً اس کا ہاتھ سینے کی طرف بڑھا اور اس نے اپنے دل کو تھام لیا۔ اس کی زبان نے اس کے دل کا ساتھ دیا۔ اور ایک دلدوز چیخ کے ساتھ وہ بیہوش ہو گیا۔ طاؤس خاں کی دور رس نگاہیں معاملے کی تہ تک پہنچ گئیں۔ پہلے تو اس نے چاہا کہ تلوار کے ایک ہی وار میں آدم خاں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے، لیکن بڑھیا نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اور کہا: "دانشمندی کا تقاضا ہے کہ اس بات کو اسی جگہ دبا دیا جائے اور ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے!"

آدم خاں کے حواس بجا ہوئے تو وہ ایک تاریک کوٹھڑی میں پڑا تھا۔ طاؤس خاں شمشیر برہنہ ہاتھ میں لئے گرج رہا تھا: "لڑکے! اسی وقت میرے گاؤں سے نکل جا!" آدم خاں کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے جنت سے نکل جانے کا حکم دے دیا ہو، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا سے پیاسا لوٹ جانے پر مجبور کیا گیا ہو، بھرے گلزار سے اس نے اپنی پگڑی پر سجانے کے لئے ایک پھول توڑنا چاہا ہو لیکن اس کے ہاتھ توڑ دیئے گئے ہوں۔ وہ اپنے گاؤں واپس آ گیا، بلکہ وہاں لایا گیا۔ آدم خاں نہیں بلکہ اس کا قالب بے جان! ــ اس کی روح دیارِ محبوب میں نغمے کی طرح آوارہ پھرتی رہ گئی اور جسم بے نغمہ رباب کی مانند حسن خاں کے گھر!

اب اسے دنیا کی ہر چیز سے نفرت ہو چکی تھی، خوبصورت دنیا کی ہر رعنائی و زیبائی سے۔ حتیٰ کہ اپنے رباب سے بھی، اس کے نغموں سے بھی! اور جب ایک دن اچانک اسکی نظر رباب پر پڑی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، وہ اسے اپنا ترجمان سمجھنے لگا۔ اور فرطِ غیظ سے کلہاڑی کے ساتھ رباب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

آدم کی حالت روز بروز غیر ہوتی گئی۔ ماں باپ کی محبت نے یہ دکھ برداشت نہ کیا، لاکھ تدبیریں کیں، علاج معالجہ کرایا، گنڈے تعویذ سے کام لیا، لیکن آدم خاں کا مرض بیکراں ہوتا گیا۔ جب حسن خاں کو یقین ہو گیا کہ اس کا اکلوتا بیٹا، اس کا حقیقی

وارث اور اس کے قبیلے کا نگہبان ہاتھ سے جا رہا ہے تو وہ بہت مضطرب ہوا اور یہ طے پایا کہ کسی نہ کسی طرح آدم خاں کو گاؤں کی حسین ترین لڑکی گلناز دکھائی جائے۔ ممکن ہے سوکھی ندی میں پانی آ جائے، آدم کے عشق کا بھڑکتا ہوا لاوا ٹھنڈا پڑ جائے اور وہ درخانئی کو بھول جائے!

پنگھٹ کے رومانی ماحول میں نقرئی قہقہوں کے سنگیت کا ہجوم تھا، چوڑیوں کے مدھر نغمات میں کائنات ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی تھی، سرخ و سفید باہوں کی کہکشائیں مست، الھڑ لڑکیوں کا جھرمٹ اور اس میں گلناز کا مرمریں پیکر۔ جیسے نرگستانِ سوات کی شہزادی گھڑی دو گھڑی کے لیے نرگس کے شبستاں سے باہر ٹہلنے آگئی ہو۔ لانبی پتلی گندھی ہوئی سیاہ بالوں کی مینڈیاں، دھڑکتے ہوئے دل کی طرح لرزتا ہوا سونے کا پیزوان، دلکش اور لب پر سجے ہوئے خودرو پھول، جس نے دیکھا مبہوت ہو گیا، لیکن آدم خاں کو گلناز کے جلالِ حسن نے بالکل متاثر نہ کیا۔ اس کا معیارِ حسن و محبت بہت اونچا تھا۔ فرشتوں کے تقدس اور حوروں کی صباحت سے بھی اونچا!

گلناز کے خدوخال، اس کے جسم کے خطوط کی شوخ محرابیں، اس کے تیکھے نقوش کی ایمان ربائی، کوئی چیز بھی آدم کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ اس نے جیسے دیکھا ہی نہیں۔ اس کی محویت، خاموشی اور خود فراموشی کی دنیا میں کوئی انقلاب نہ آیا۔ نرگس کی ہر آنکھ میں اسے درخانئی ہی کی تصویر نظر آئی، لالۂ صحرائی کے احمریں پیالے میں درخو کھڑی اسے بلا رہی تھی، وہ ہر بار اس تخیلی پیکر کی طرف لپکتا اور ہاتھ پھیلا کر رہ جاتا۔ درخانئی فضا میں تحلیل ہو جاتی اور آدم کے سینے پر داغ چھوڑ جاتی۔ اور فضا کا ہر ذرہ نرگس کی آنکھ سے آدم کی دیوانگی کا تماشا کرتا۔

ہجر و فراق کے طویل لمحے طویل تر ہوتے گئے، آدم خاں کی دیوانگی کا رنگ پختہ تر ہوتا گیا۔ آخر ایک دن بازدرہ میں اس خبر نے کہرام مچا دیا کہ "آدم خاں مر گیا!"

کسی نے کہا "ہمارا مغنی مرگیا"۔ کسی نے "عاشق صادق مرگیا" اور کسی نے "شہزادی درخانئی کا رباب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا! اب کون نغمے سنائے گا؟"

بازدرہ میں نغمے مرگئے، اور رہزن زندہ ہوگئے! درخانئی رنگین پایوں والے پلنگ پر دراز، روئیں روئیں میں آدم خاں کو بسائے ہر لحہ اسی کے خواب دیکھتی رہتی۔ بڑھیا اس کے سرہانے بیٹھی رہتی۔ اپنے باپ طاؤس خاں کی بھری بستی میں یہی ایک ہمدرد اور اس کے دکھ درد کو جاننے والی تھی، لیکن غریب بڑھیا کی کوئی سننے والا نہیں تھا، اس کے کہنے پر کوئی کان ہی نہ دھرتا تھا۔ درخانئی کے لئے تو اس کی ماں کی ممتا بھی مرچکی تھی۔ اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر کا ٹکڑا تھا۔ ماں کی ممتا پر باپ کے شملے کی غیرت اور قبیلے کی روایتی عزت غالب آچکی تھی، اب درخانئی کا آخری سہارا اس کے خواب ہی تھے! اس نے خواب میں دیکھا:۔

ایک بے حد خوبصورت باغ ہے جہاں وہ سہیلیوں کے ساتھ سیر کر رہی ہے۔ یکایک باغ کے ایک گوشے سے رباب کے نغمے ابھرنے لگے۔ جب درخو نے اس طرف رخ کیا تو سرو و شمشاد کے ہجوم میں ایک بڑے تالاب کے بیچ، چاندی کی کشتی میں آدم خاں بیٹھا رباب پر درخو کے گیت گاتا دکھائی دیا، اس نے درخو کو دیکھکر اپنی آغوش وا کردی اور درخانئی جل پری کی طرح پانی کی لہروں پر چلتی ہوئی آدم کی آغوش میں کھوگئی۔ آدم نے کہا "بس درخو، اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا، ہم اسی کشتی رہیں گے، ہیں اپنے لئے نیا گاؤں بنائیں گے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تالاب ایک سمندر میں تبدیل ہوگیا، ایک خوفناک طوفان آیا، اور کشتی الٹنے لگی۔ درخانئی نے ایک چیخ ماری اور جب اس کی آنکھ کھلی، تو اپنے سرہانے بڑھیا کو پایا جو اسے تسلی دے رہی تھی۔ وہ بڑھیا سے لپٹ کر رونے لگی "میرا آدم کہاں ہے خالہ؟ اس کی کشتی ڈوبی تو نہیں؟"

بڑھیا نے کہا "درخانئی بیٹا! آدم خان تمہارے ماں اور باپ کی ضد پر قربان ہوگیا! وہ اس دنیا سے چلا گیا! آدم نے تیرے فراق میں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

درخو بیٹی؟ اور جیسے درخانئ کا کسی نے گلا گھونٹ دیا، اس کے منہ سے صرف "آدم خاں!"
نکلا۔ اس نے اپنا سر تکئے میں چھپا لیا! ایک طویل عرصے تک اس نے سر نہ اٹھایا۔ تو بڑھیا
کو فکر لاحق ہوئی۔ جب اس نے اسے جھنجھوڑا تو وہ آدم خاں کے پاس جا چکی تھی!!

کہتے ہیں جب درخانئ کو قبر میں اتارا گیا تو تھوڑی دیر بعد یوں محسوس ہوا گویا
قبر میں دو لاشیں جمع ہو گئی ہیں! جب دوسری لاش کے منہ سے کفن ہٹایا گیا تو وہ آدم خاں
کی لاش تھی!!

آدم خاں اور درخانئ کا مزار آج بھی مرجع عوام ہے۔ آدم کے مزار کے
درخت کی لکڑی کا مضراب نغمہ و موسیقی کے ہر شائق کی انگلیوں میں جادو بھر دیتا ہے۔
عشق و نغمہ کے ان شہیدوں کی یہ کرامت ہے!

محبوبہ جلات

خاطر غزنوی

پشاور کی سنٹرل جیل کے سامنے والے سرخ محرابی پل سے کچھ دور ایک نہایت قدیم شکستہ مقبرہ ہے، جس کے اندر چند نئی قبروں کے علاوہ دو پرانی قبریں بھی ہیں۔ اکثر سنا ہے، کہ یہ قبریں محبوبہ اور جلات کی ہیں۔ محبوبہ اور جلات خاں کی داستان محبت سابق صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے کے عوام میں آدم خاں درخانی اور موسیٰ خاں گل مکئی کی طرح مقبول ہے۔ اس مزار سے ہٹ کر جنوب مشرق کی طرف — گورنمنٹ زنانہ نارمل سکول کے سامنے اور ڈبگری پولیس چوکی کے ساتھ ہی ایک اور مقبرہ ہے، جس میں چھ قبریں ہیں۔ مشہور ہے کہ یہ چھ قبریں جلات خاں کے اُن چھ بھائیوں کی ہیں جنھیں نامسلم نے قتل کرا دیا تھا۔ اس مقبرے کے مجاور سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں ملا میر دفن ہیں۔ اگر یہ بات بھی صحیح مان لی جائے تب بھی یہ قبول کرنا پڑے گا، کہ یہ رومان بعض دوسری داستانوں کی طرح من گھڑت نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے، کیونکہ ملا میر بھی جلات اور محبوبہ کی داستان کا ایک کردار ہے۔ ملا میر یا جلات کے چھ بھائیوں کے مقبرے کے سامنے کچھ کھیت ہیں۔ تاج محل ہوٹل کے بالکل سامنے — یہاں ایک چبوترے پر ایک قبر ہے اس قبر کے متعلق میں نے جس کسی سے بھی دریافت کیا یہی جواب پایا کہ یہ جھنڈی کی قبر ہے۔ جھنڈی سنار — یہ بھی اسی رومان کا اہم کردار ہے۔

بڑی بوڑھیوں سے اس رومان کے متعلق جو کچھ سنا اس سے یہ باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں کہ قدیم پشاور محبوبہ کے باپ نامسلم کا دارالخلافہ تھا اور بازار قصہ خوانی اس کا دربار تھا۔ چونکہ نامسلم قصے کہانیاں سننے کا بے حد مشتاق تھا اور مختلف ملکوں کے لوگ اور سوداگر اس کے دربار میں اپنے اپنے وطن کی کہانیاں سناتے تھے، اس لئے اس دربار کا، جو بعد میں بازار بن گیا، قصہ خوانی نام پڑ گیا۔ لیکن یہ دلیل اس قدر وزنی نہیں۔ یہ محض روایت ہی ہے۔ البتہ ہزار خوانی (جو پشاور سے چار میل جنوب مغرب کی طرف ایک گاؤں ہے) کے قریب ایک پرانے زمانے کی عمارت، جس میں بھول بھلیاں بنی ہوئی ہے، ضرور موجود ہے اور یہ بھول بھلیاں اسی شہزادی محبوبہ سے منسوب ہے۔

"ملی ہندارہ" مرتبہ محمد گل نوری میں بھی یہ رومان "جلات شمائمہ" کے عنوان سے درج ہے۔ اس میں باقی کہانی تو اسی طرح درج ہے جیسے سرحد کے سبھی علاقوں میں مشہور ہے لیکن اس میں زیب داستاں کے لئے یا محض کہانی سمجھ کر کچھ بعید از قیاس باتوں کا اضافہ بھی ہے، مثلاً جلات کا باپ خونکار اور محبوبہ کا باپ نامسلم آپس میں بھائی تھے، اور ان دونوں کا باپ چڑی مار تھا، اسے ایک بار پہاڑوں میں شکار کھیلتے ہوئے ایک انڈا ملا جو بازار میں ایک جوہری نے گراں قدر رقم پر خرید لیا۔ چڑی مار کو اب یہ انڈا ہر روز اسی مقام پر ملنے لگا اور وہ روزانہ اسی امیر کے پاس فروخت کر کے دولت کے ڈھیر جمع کرتا رہا۔ ایک دن اس نے جال بچھا کر انڈا دینے والا پرندہ ہی پکڑ لیا۔ چڑی مار کے مرنے کے بعد اس کی بیوی نے انڈا خریدنے والے شخص کو کھانے کی دعوت دی۔ لیکن وہ جوہری اس شرط پر آیا کہ انڈا دینے والا پرندہ بھون کر اسے کھلایا جائے۔ اس کی یہ شرط مان لی گئی۔ لیکن نوکرانی نے پرندے کا دل اور سر دعوت سے پہلے ہی خونکار اور نامسلم کو کھلا دیا۔ در اصل امیر آدمی جانتا تھا کہ اس پرندے کا دل اور سر جو شخص کھائے وہ بادشاہ بن جائے گا۔ پتہ چل جانے اور امیر آدمی کے کہنے پر چڑی مار کی بیوی نے اپنے بچوں کو قتل کر کے ان کے پیٹوں سے

پرندے کا سر اور دل نکالنا چاہا۔ لیکن بچے بروقت اطلاع پاکر بھاگ گئے اور آخر ایک دوسرے سے بچھڑ کر الگ الگ بادشاہ بن گئے" لیکن اس کے برعکس منشی احمد جان نے یہی کہانی "وقصہ خوانی کپ" نامی کتاب میں لکھی ہے جس میں ایسی بعید از قیاس باتوں سے دامن بچایا گیا ہے۔ اس میں "ملی ہندارہ" کی طرح بے سر دپا باتیں نہیں ہیں۔

اس رومان کو کئی شعرائے پشتو نے نظم بھی کیا جن میں مشہور عوامی شاعر ملا نعمت اللہ اور عبدالکریم کے "بدلے" خاص طور پر مشہور ہیں۔ پشتو کے ایک اور عوامی شاعر استاد فدا مطہر نے جو ابھی بقید حیات ہے۔ اس رومان کو مختصر طور پر منظوم کیا ہے جس کا بعد میں گرافون ریکارڈ بھی تیار ہوا اور پٹھانوں میں بہت مقبول ہوا ہے۔

لیکن دراصل یہی کہانی ۱۰۸۰ھ (مطابق ۱۶۷۷ء) کو کوہ وتیری نے بھی مثنوی کی صورت میں لکھی تھی۔ اس کے علاوہ پشتو کے مشہور صوفی شاعر عبدالرحمٰن بابا کے بھانجے حمید گل نے بھی جلات اور محبوبہ کو منظوم کیا تھا۔ عبدالرحمٰن بابا کی زندگی ۱۰۴۳ھ (مطابق ۱۶۳۳ء) سے ۱۱۱۸ھ (مطابق ۱۷۰۸ء) تک ہے۔ اس لحاظ سے حمید گل ۱۱۰۰ھ (مطابق ۱۶۹۰ء) کے لگ بھگ زندہ تھا۔ وہ ایک عوامی شاعر تھا اور اس کے نغموں کی گونج قندھار اور رخراپور تک پہنچی ہوئی تھی۔ حمید گل کی منظوم کہانی کے کچھ حصہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

خونکار بادشاہ کے پھولوں جیسے چھ بیٹے تھے جو نامسلم نے یکے بعد دیگرے قتل کرا دیئے۔ ساتواں لڑکا جلات جو باقی رہ گیا، ایک دن باپ کے پاس آیا اور آداب بجا لایا اور کہا: "اے والد، اب میں تجھ سے اجازت چاہتا ہوں، میرے دل میں جو آگ بھڑک رہی ہے، اب اس سے کالے نیلے دھوئیں اٹھنے لگے ہیں۔" خونکار بادشاہ نے جواب دیا۔ "بیٹا مت جاؤ۔ نامسلم بڑا ظالم ہے۔ میں اپنے دل پر چھ تیر کھا چکا ہوں۔ اب تو صرف تم ہی رہ گئے ہو جسے دیکھ کر میں جیتا ہوں۔"

اسی طرح سرحد کے ایک اور عوامی شاعر باذر (بہادر) نے بھی اس رومان کو چار بیتہ کی صورت میں منظوم کیا۔ یہ چار بیتہ وار مسٹیر نے "ہار و بہار" نامی کتاب میں بھی شامل کیا ہے۔ محبوبہ اور جلات کے درمیان سوال اور جواب کی صورت میں ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

جلات کہتا ہے:-

"اے محبوبہ! رات تم نے مجھے کٹاریوں سے مارا۔ اب میں رو رہا ہوں۔ میری آنکھیں سرخ ہیں اور تمہارے لئے زخمی بیٹھا ہوں۔ محبوبہ! رات تم نے مجھے گھائل کیا، تکلیف میں ہوں، تمہاری تہمت اٹھائے پھر رہا ہوں۔ اے کاش! خدا میرا مقصد پورا کر دے! میرا دل طوطی کی طرح آہستہ آہستہ فریاد کر رہا ہے، میں عشق کے شعلوں میں جل چکا ہوں۔ ہر جگہ میرا ہی چرچا ہے۔ تمہاری سیاہ آنکھیں پھر مجھ سے جدا ہو گئی ہیں۔ تم نے جو بانات کے کپڑے پہن لئے اور اپنے چہرے پر زلفیں پھیلا دیں تو میں تو میں دیوانہ ہو کر صحراؤں میں پھرتا ہوں، اور شیروں کی خوراک بن گیا ہوں۔ میری بیماری بڑھتی جا رہی ہے، اے محبوبہ! رات تم نے مجھے گھائل کر دیا۔"

محبوبہ جواب میں کہتی ہے:-

"تم کیوں صحراؤں میں بھٹکتے ہو۔ تمہاری بیماری تو یقیناً بڑھے گی۔ میرے سینے پر میری زلفیں جھول رہی ہیں اور میرے ماتھے پر سونے کی مہریں لگی ہیں جس طرح تم میرے ملنگ بن گئے ہو اسی طرح میرے دربار میں کتنے ہی ملنگ پڑے ہیں خراسان کے بڑے بڑے جوان میرے ساتھی بننے کے لئے تیار ہیں۔ تم میرے باپ نامسلم کے پاس جاؤ اور اس کی منت و خوشامد کرو۔ اپنی زندگی کوششوں میں گزار دو۔ آخر وہ ایک دن مہربان ہو کر مجھے تمہارے حوالے کر دے گا۔"

یہ رومان سرحد کے دیہات میں جس طرح مشہور ہے اور اسے عبدالکریم نے جس طرح منظوم کیا ہے وہ یوں ہے کہ نامسلم نامی ایک بادشاہ نے انچاس شادیاں

گیس اولاد نرینہ سے محروم ہی رہا۔ اس کے ہاں جب بھی لڑکی پیدا ہوتی، وہ اسے قتل کروا دیتا تھا۔ کرنا خدا کا یوں ہوا کہ اس کی سب سے چھوٹی بیگم کے ہاں بھی ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس نے لڑکی کو قتل کے خوف سے ایک تہہ خانے میں چھپا دیا۔ اور ایک عورت کو اس کی پرورش پر مقرر کر دیا۔ لڑکی کا نام محبوبہ رکھا۔ محبوبہ جب دس برس کی ہوئی تو اسے ایک دن تہہ خانے سے باہر نکالا، لڑکی زرق برق لباس پہنے محل میں گھوم رہی تھی کہ اچانک بادشاہ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ لڑکی کا بے پناہ حسن دیکھ کر ناسلم کو اس کے متعلق پوچھ گچھ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس وقت محبوبہ کے ساتھ اس کی ماں بھی تھی۔ ناسلم نے اسے اپنے پاس بلا کر پوچھا کہ یہ لڑکی کون ہے۔ بیگم نے بادشاہ کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ ناسلم نے یہ سن کر اس کے لئے ایک بھول بھلیاں بنائی۔ اور محبوبہ کو اس میں رکھا، اور سب بیگمات سے وعدہ لیا کہ اس واقعہ کو ہوا نہ دیں۔ اب محبوبہ بھول بھلیاں والے قلعہ میں رہنے لگی۔ اسے وہاں ہر قسم کی سہولتیں، آرام اور آسائشیں میسر تھیں۔

ایک دن محبوبہ قلعہ کی دیوار پہ کھڑی مناظر فطرت کی رنگینیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسی قلعہ کی دیوار کے نیچے ایک مست الست فقیر ایک درخت کے سائے میں پڑا ہوا تھا۔ اچانک اس کی نظر محبوبہ پر پڑی، اور وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ محبوبہ نے اسے دیکھا تو اسے اس کی گستاخانہ نظر بازی پر بڑا غصہ آیا، فوراً اس نے سپاہیوں کو حکم دے کر اسے پٹوا ڈالا۔

فقیر کو بھی غصہ آیا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ اس کا بدلہ ضرور لے گا۔ چنانچہ وہ سیدھا خونکار بادشاہ کے ملک میں پہنچا۔ خونکار بادشاہ کے سات بیٹے تھے۔ اس نے سب سے بڑے بیٹے کو محبوبہ کے حسن جہاں سوز سے آگاہ کیا۔ اور اسے محبوبہ کے حاصل کرنے پر اکسایا۔

اِدھر جب آہستہ آہستہ لوگوں میں یہ خبر پھیلی کہ بادشاہ کی ایک لڑکی بھی ہے تو کئی لوگ اس شہزادی کو حاصل کرنے کی غرض سے آئے۔ بادشاہ نے بھول بھلیاں

کچھ اس قسم کی بنا رکھی تھی کہ ڈھونڈنے والا ہر پھر کر وہیں آ پہنچتا۔ جہاں سے وہ چلا ہوتا۔ آخرکار یہ بھول بھلیاں اسے ناکام بنا دیتی اور وہ ناسلم کے حکم سے قتل کرا دیا جاتا۔

خونکار کا بڑا لڑکا محبوبہ کے دیس پہنچا اور ناسلم کے دربار کا نقارہ بجایا۔ بھول بھلیاں میں وہ محبوبہ کو نہ پا سکا اور تلوار کے گھاٹ اتر گیا۔ یہ خبر اس کے وطن پہنچی تو اس کے چھوٹے بھائی کو محبوبہ کے حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا لیکن وہ بھی اسی طرح محبوبہ پر قربان ہو گیا۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور خونکار کے چھ بیٹے قتل ہو گئے۔ سب سے چھوٹا شہزادہ جلات تھا۔ وہ بھی اس مہم پر چل کھڑا ہوا۔ راستے میں اسے ایک فقیر کامل ملا جس نے اسے کچھ عرصہ اپنے پاس ٹھہرا کر مختلف علوم کی تعلیم دی۔ اور آخر جلات کو ملا ہیر کا پتہ دے کر اس مہم پر رخصت کیا۔ شہزادہ فقیروں کے لباس میں ناسلم کے شہر آیا اور گھومنے لگا۔

محبوبہ کی ایک بڑی محبوب خدمت گار "خوارہ مشے" تھی۔ اس دن وہ محبوبہ کے لئے عطریات خریدنے بازار آئی تھی۔ جب اس کی نظر جلات پر پڑی تو اس کے حسن بے مثال سے مرعوب ہو کر وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اسے تن بدن کا ہوش تک نہ رہا۔ شام کو سودا خرید کر واپس گئی تو محبوبہ اس پر بہت ناراض ہوئی لیکن خوارہ مشے نے محبوبہ سے کہا کہ اس نے شہزادی کی آرائش کے لئے عطریات سے بھی اچھی چیز دیکھی ہے۔ چنانچہ اس نے اس فقیر کے حسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ محبوبہ کو اسے دیکھنے کا بے حد اشتیاق پیدا ہو گیا اور اس نے بادشاہ سے کہہ فقیروں کے لئے خیرات کا انتظام کیا، اور اس طرح جلات کا دیدار اسے نصیب ہوا۔ محبوبہ جلات کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئی۔

ادھر جلات ناسلم کے دربار میں نقارہ بجانے کے لئے پہنچا تو وہیں ملا ہیر نے اس کی دستگیری کی۔ اسے نقارہ بجانے سے روکا اور مہندی سنار کا

پتہ دے کر کہا کہ وہ ایک آدھ سال تک اس کی نوکری کرے۔ کیونکہ اس کے بعد ہی محبوبہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے گا۔ مہندی کی ماں شہزادی محبوبہ کے لئے روزانہ پھولوں کے ہار تیار کر کے لے جایا کرتی تھی اور مہندی خود محبوبہ کے زیورات بنایا کرتا تھا۔ جلات مہندی سے ملا تو مہندی اس سے بڑی عزت سے پیش آیا اور اپنی ماں سے یہ بیان کیا کہ یہ تمہارا وہ بھانجا ہے جو بچپن میں گھر سے نکل گیا تھا۔

اب شہزادہ مہندی ہی کے گھر میں رہنے لگا۔ دونوں ہم عمر ہی تھے۔ آپس میں ایک دوسرے سے بے حد پیار کرنے لگے۔ انہوں نے دن بھر کام کرنا شروع کر دیا۔ جلات کے حسن کی دھوم شہر بھر میں مچ گئی۔ لڑکیاں اسے دیکھنے کی غرض سے اپنے زیورات جان بوجھ کر توڑ دیتیں۔ جلات کے گرد سارا سارا دن حسین و جمیل لڑکیوں کی ٹولیاں پروانوں کی طرح منڈلاتی رہتیں۔

سارے شہر میں جلات کے حسن کی شہرت پھیل گئی اور لڑکیوں نے جان بوجھ کر اپنے جھومر توڑنے شروع کر دیئے۔ اب اس کے ارد گرد ہر روز سیکڑوں لڑکیاں بیٹھی رہتیں۔ لیکن شہزادہ جلات نے سنار کا کام سیکھ لیا تھا۔ اس کی وجہ سے مہندی نے بے شمار دولت کمائی۔

ایک دن بڑھیا کو شہزادی محبوبہ کا ہار بنانے میں دیر لگ گئی۔ وہ بہت گھبرائی لیکن جلات نے اس موقع پر اپنی خدمات پیش کیں۔ اور شہزادی کیلئے ایک بڑا خوبصورت ہار تیار کر دیا۔ جب محبوبہ نے ہار پہنا تو اس کی خوبصورتی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکی۔ بڑھیا سے پوچھا یہ ہار کس نے بنایا ہے۔ بڑھیا نے جلدی اور خوف کے مارے کہہ دیا کہ یہ ہار میری بیٹی نے بنایا ہے۔ شہزادی نے حیرت سے پوچھا کہ اس سے پہلے تو میں نے کبھی تمہاری بیٹی نہیں دیکھی۔ بڑھیا نے کہا اس کی شادی ہو چکی ہے اور وہ دوسرے شہر میں رہتی ہے۔ ان دنوں مہمان

آئی ہوئی ہے۔ شہزادی نے کہا کل اپنی بیٹی کو میرے پاس حاضر کرنا۔

اب بڑھیا کو اپنی جان کا خطرہ پیدا ہوا، اس نے شہزادے اور جہمندی سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ شہزادے نے کہا مجھے عورتوں کا لباس لا دو، میں بھیس بدل کر شہزادی کے پاس جاؤں گا۔ آخر ایسا ہی کیا گیا۔ شام کو بڑھیا بھیس بدلے ہوئے جلات کو لے کر محبوبہ کے پاس پہنچی۔ جلات وہیں رہ گیا۔ اور بڑھیا واپس چلی گئی۔ جلات لڑکیوں کے لباس میں بالکل نہ پہچانا جا سکتا تھا۔ شہزادی نے جلات کو دیکھا اور وہ اسے بے حد پسند آیا۔ تمام رات شہزادی۔ بڑھیا کی بیٹی سے باتیں کرتی رہی۔ لیکن اسے پہچان نہ سکی۔ صبح بڑھیا آئی اور جلات کو لے گئی۔

جلات محبوبہ کے حسن و جمال پر ہزار جان سے فریفتہ ہو چکا تھا۔ جہمندی سے کہا۔ اب میرا بندوبست کرو۔ ورنہ میں بھول بھلیوں میں کھو کر جان دے دوں گا۔ جہمندی کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے کاٹھ کا ایک کھوکھلا شیر بنایا، جسے چابی دی جاتی۔ شیر کے اندر جلات کو بٹھا دیا، اور وہ شیر نامسلم بادشاہ کے پاس لے گیا۔ چابی دینے پر شیر نے دربار میں طرح طرح کی دلچسپ حرکتیں شروع کر دیں۔ بادشاہ جہمندی کی یہ ایجاد دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ادھر محل کے اس شیر کی اطلاع شہزادی محبوبہ تک پہنچی، تو اس نے فوراً باپ سے یہ شیر مانگا۔ بادشاہ نے ایک رات کے لئے یہ شیر جہمندی سے مانگ کر شہزادی کے پاس بھجوا دیا۔ محبوبہ اور اس کی سہیلیاں رات گئے تک شیر کا تماشہ دیکھتی رہیں۔ آخر تھک کر سو گئیں تو شہزادہ کاٹھ کے شیر میں سے نکلا اور محبوبہ کی انگوٹھی اتار لی، اور اس کا دوشالہ اتار کر اپنا دوشالہ اسے اڑھا دیا، اور پھر شیر میں داخل ہو گیا۔ محبوبہ کی آنکھ کھلی تو بدلا ہوا دوشالہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ ہاتھ دیکھا تو انگوٹھی بھی نہ تھی۔ اس نے اپنی سہیلیوں کو جگا کر ڈانٹا۔ لیکن سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ آخر وہ سو گئیں۔ جلات پھر شیر سے باہر نکلا۔ اب کے محبوبہ یوں غافل نہ سوئی تھی۔ جلات نے

چپکے سے محبوبہ کی ٹھوڑی کو چوم لیا اور جلد ہی شہر میں داخل ہونے لگا۔ لیکن محبوبہ اسے دیکھ چکی تھی۔ اس نے جلات کو آواز دی۔ ٹھہر جاؤ۔ اب تم یہاں سے زندہ واپس نہ جا سکو گے۔ جلات ٹھہر گیا۔ اس نے جواب دیا جہاں میرے چھ بھائی تمہاری وجہ سے قتل ہو چکے ہیں، وہاں میرا قتل ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔" محبوبہ نے چھ قتلوں کے متعلق استفسار کیا تو جلات نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ شہزادی جلات کو پہچان چکی تھی اور اس کے حسن سے پہلے ہی مرعوب تھی، اس لئے اس نے اسے بھول بھلیاں کا راز بتا دیا۔

دوسرے دن صبح جھنڈی اپنا کل کا شیر واپس لے گیا۔

گھر واپس پہنچتے ہی جلات نے اپنے باپ کے نام ایک پیغام بھیجا کہ وہ فوجیں لے کر فوراً پہنچے اور خود بادشاہ کے دربار میں جا کر نقارے پر چوٹ لگا دی۔ وہ بھول بھلیاں میں داخل ہو گیا۔ محبوبہ ایک الجھے ہوئے مقام پر ریحاں کی اوٹ میں چھپی بیٹھی تھی۔ شہزادے نے اسے پا لیا۔ جب وہ باہر آئے تو بادشاہ نے کہا کہ یہ سب فریب معلوم ہوتا ہے۔ اس نے شہزادی کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن جھنڈی برق رفتار گھوڑا لئے باہر منتظر تھا۔ شہزادے نے محبوبہ کو گھوڑے پر بٹھایا اور یہ تینوں بھاگ نکلے۔ ناسلم کے سپاہیوں نے ان کے تعاقب میں اپنے گھوڑے ڈال دیئے۔ ادھر پیغام پہنچتے ہی خونکار نے فوراً فوج تیار کی۔ اور چل پڑا۔ راستے میں انہیں جلات مع شہزادی کے ملے۔ اتنے میں ناسلم کی فوج بھی آ پہنچی دونوں فوجوں کے درمیان بڑی خوں ریز لڑائی ہوئی۔ آخر ناسلم کی فوج نے شکست کھائی۔ ناسلم گرفتار ہو گیا اور جلات اور محبوبہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو گئے۔

یوسف کڑہ مار

رضا ہمدانی

سرسبز و شاداب چراگاہوں، سونا اگلتی کھیتیوں اور دودھ بھرے تھنوں والی سینکڑوں بھیڑوں کے باوجود حسین کاکا ہمیشہ مغموم رہتا۔ اس کی ضرب المثل خوشحالی اور مہمان نوازی کے افق پر یاس و اندوہ کے بادل ہر وقت چھائے رہتے۔ حدنگاہ تک پھیلے ہوئے ثمردار باغات میں اس کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کا نخل زندگی بے ثمر تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ ان چراگاہوں میں کوئی ایسا بچہ ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا ہوا دیکھے جسے حسین کاکا کا وارث کہا جائے۔ اس وقت اس کے دل سے ہوک اٹھتی جب وہ یہ خیال کرتا کہ اس کے مالا مال کھیت اس کی حقیقی اولاد کی بجائے اس کے "تربوروں" یعنی ایک دادا کی اولاد کے قبضے میں چلے جائیں گے اور جب وہ آئینے میں اپنے سفید بال اور گھنی براق داڑھی دیکھتا تو ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتا۔ ساٹھ سال کی طویل مدت سے اس کے گھر کی چاردیواری نے کسی بچے کے رونے کی آواز نہ سنی تھی اور وہ دل ہی دل میں قدرت سے گلہ کرتا، احتجاج کرتا۔ وہ بظاہر ہشاش رہتا تاکہ اس کے "تربور" اس کی اس کمزوری کو بھانپ نہ لیں۔ اگر کوئی اس سلسلے میں اس کے ساتھ ہمدردی جتاتا تو وہ ہنس کر کہتا خدا کی مرضی اسی طرح ہے، اس کے بھید ہم کیا جانیں۔ اسی میں کوئی بھلائی ہوگی"۔ لیکن یہ غم اسے گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر اپنی بے اولادی پر کڑھ رہا تھا۔ وہ کئی مرتبہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر پیروں فقیروں کے پاس اور خانقاہوں پر زیارت کے بہانے گیا،

دعائیں کیں منتیں مانیں اور جب ایک دن اسے معلوم ہوا کہ اس کے نخل تمنا میں پھل آنے والا ہے تو وہ بڑا خوش ہوا۔ آخر وہ گھڑی آ پہنچی جب حسین کاکا کے گھر کی دیواروں نے ایک حسین وجمیل بچی کے رونے کی آوازیں سنیں۔ لڑکی کا نام بندئی رکھا گیا دشمنوں نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ لڑکی ہی تو ہے۔ اصل وارث تو لڑکا ہوتا ہے۔ لیکن حسین کاکا بڑا خوش تھا۔ اس نے لڑکی کو سو لڑکوں کے برابر سمجھا اور قدرت کو اس کی قدردانی پسند آئی۔ دوسرے سال بندئی کے لئے قدرت نے ایک بھائی بھیج دیا، چاند الیسا لڑکا۔ اس دن حسین کاکا نے دل کھول کر بندوق کے فائر کئے، دوست احباب اور اپنے پرائے سبھوں نے حسین کاکا کی خوشحالی میں اتنے فائر کئے کہ دور دور کے لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید دو قبیلوں میں جنگ ہو رہی ہے۔

بچہ بڑا خوبصورت اور پیارا تھا جس نے دیکھا اس نے کہا یوسف ثانی ہے۔ آخر حسین کاکا نے اس کا نام یوسف ہی رکھ دیا۔ بچپن کے دن ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گئے۔ باپ نے اسے مدرسہ بھیج دیا۔ اور جب اس نے شباب میں قدم رکھا تو حسن وصورت کے علاوہ وہ علم کے زیور سے بھی آراستہ ہو چکا تھا۔ اس کے حسن ورعنائی کا شہرہ دور دور پہنچ چکا تھا، یوسف زئی قبیلے کے اس جوان رعنا کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ ترلانڈی گاؤں میں لوگوں کے لئے ایک خاص کشش پیدا ہو گئی۔ شکار کے لئے جو بھی کرہ مار جاتا ترلانڈی میں ضرور پڑاؤ کرتا۔ حسین کاکا کا حجرہ ایسے مہمانوں کے لئے ہر وقت کھلا رہتا۔

حسین کاکا کب تک زندہ رہتا؟ اس کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا، لیکن وہ مرتے وقت بڑا خوش تھا۔ اُسے اطمینان تھا کہ جان دیتے وقت اس کے دونوں ہاتھ یوسف اور بندئی کے ہاتھ میں ہیں سا اپنے وارثوں کے ہاتھ میں۔ اب وہ لاوارث نہیں تھا بلکہ مال و دولت کے ساتھ ساتھ اس کا ایک شمشاد قد بیٹا بھی تھا ــــ جو اسے اپنے ہاتھوں قبر میں اتارے گا اور اس کی ایک لڑکی بھی تھی جو بابا بابا کر کے اس کی میت پر روئے گی۔ اس کا جنازہ بڑے اہتمام سے اٹھایا جائے گا۔ اس کے پیچھے خیرات اور صدقہ دینے والے موجود تھے۔ وہ مطمئن تھا کہ اس کا لڑکا اپنے باپ کی میت کے ساتھ اس کے شایان شان سلوک کرے گا۔

حسین کاکا کی موت کے بعد یوسف آزاد تھا بلکہ اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ زمینداری کی دیکھ بھال، مال جائداد کا تحفظ، ترلوروں اور دشمنوں کی سازشوں اور شرارتوں کا سدباب۔ ان تمام الجھنوں نے یوسف کو بڑی حد تک سنجیدہ بنا دیا تھا وہ ہر وقت سوچتا رہتا کہ ان تمام ذمہ داریوں سے وہ کس طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ وہ ذہین تھا، عقلمند تھا، سارے قبیلے میں اس کی خوش اخلاقی ضرب المثل بن چکی تھی۔ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح آوارہ نہیں تھا اور نہ اسے آوارگی پسند تھی۔ وہ اُن کے ساتھ کھیل کود میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ اس کے ساتھی جب تفریح میں مصروف ہوتے تو یہ ان سے الگ تھلگ ایک طرف کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ یوسف کی اسی خلوت پسندی نے اسے "یکہ" یوسف مشہور کر دیا تھا یعنی تنہا رہنے والا یوسف۔ اس یکسوئی نے اگرچہ یوسف کو ایک حد تک مضمحل بنا دیا، لیکن اس نے اپنے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکال لی۔ ایکا ایکی اسے شکار سے دلچسپی ہوگئی۔ دور دُور سے جو لوگ بھی کڑہ مار کو شکار کے لئے آتے اور یوسف کے حجرے میں شب بسر کر کے صبح شکار کو روانہ ہوتے یوسف بھی ان کے ساتھ ہوتا اس غرض کے لئے اس نے چُست و چالاک کتے پالے۔ وہ کتوں کی بڑی خبر گیری کرتا۔ اس نے ان کے پاؤں کے لئے چاندی کے گھنگرو بنوائے، جب صبح ہوتی اور وہ کتوں کو ساتھ لے کر کڑہ مار کی طرف جاتا تو گھنگروؤں کی آواز دور دور تک سنائی دیتی۔ لوگ سمجھ جاتے کہ یوسف شکار کو جا رہا ہے۔

یوسف کے گاؤں اور شکار گاہ میں تین میل کا فاصلہ تھا۔ راستے میں ایک گاؤں سکندر آباد پڑتا۔ "شیر بانو" اسی گاؤں کے ملک کی بیٹی تھی۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب، کڑہ مار کے دامن میں بسنے والی ہزاروں لڑکیوں میں ایک۔ جب یوسف صبح کی ملگجی فضا میں شکار گاہ کی طرف جاتا اور کتوں کے نقرئی گھنگرو اپنی موسیقی چاروں طرف بکھرتے تو لوگ باگ مکانوں کے دروازوں، منڈیروں، گلیوں اور حجروں میں کھڑے ہو کر تر لاندی والے حسین کاکا کے شمشاد قد بیٹے یوسف خان کو دیکھتے، اسے خوش آمدید کہتے۔ وہ ہر ایک کو سلام کرتا، ہاتھ ملاتا، خیریت پوچھتے شکار گاہ کی طرف چلا جاتا۔

ایک دن جب گھنگروؤں کی خوش آہنگی کو ہوا نے چاروں طرف بکھیرا تو شیر بانو کے دل میں بھی یوسف کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی اور جب اس نے یوسف کو دیکھا تو پہلی ہی نظر میں اس کے انگ انگ نے یوسف کو قبول کر لیا۔ اس کے دل میں ایک کسک سی پیدا ہوئی اس کا رُواں رُواں ٹپے الاپنے لگا، اس کے دل کی شاداب وادی میں نئی آرزوئیں اور امنگیں "اتن ناچ" ناچنے لگیں اس نے ایک دولت پالی تھی۔ لیکن اپنا آپ کھو چکی تھی۔ یوسف جا چکا تھا۔ ایک کوندا تھا جو لپکا اور آنکھوں کو خیرہ کرتا ہوا غائب ہو گیا۔ وہ سدھ بدھ بسرائے بت کی طرح خاموش کھڑی یوسف کے قدموں کے نقوش میں اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ نہ معلوم کب تک کھڑی رہی۔ اگر اس محویت کے طلسم کو اس کی ماں کی گرجدار آواز نہ توڑتی تو شاید وہیں کھڑی رہتی اور پھر اس کا معمول ہو گیا۔ ہر صبح وہ اٹھتی، گھنگروؤں سے اس کے دل کے رباب کے تار جھنجھنا اٹھتے، وہ یوسف کو دیکھتی تو دیکھتی ہی رہ جاتی، یوسف بے نیازانہ اس کے ارمانوں کو لتاڑتا ہوا چلا جاتا۔ اس کے ساتھ آنکھیں چار کرنے کی خواہش شیر بانو کے دل میں چٹکیاں لیتی لیکن یوسف شیر بانو کے دل کو تاراج کرتا ہوا بے نیازانہ گزر جاتا۔ شیر بانو کے طرز روش پر اس کی ماں کا ماتھا ٹھنکا، اس نے اپنے شوہر سے شیر بانو کی محبت کا ذکر کیا۔

ایک دن جب دوپہر کی تپش اپنے شباب پر تھی، شیر بانو یوسف کے خیال میں محو چارپائی پر دراز چھت کی کڑیاں گن رہی تھی، پسینے کے قطرے اس کے ماتھے پر افشاں کی طرح چمک رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ شیر بانو کا دل دھڑکنے لگا، وہ بے اختیار دروازے کی طرف لپکی۔ دروازہ کھولا تو ایک بھولی بھالی لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی، اس کے خد و خال میں یوسف کے نقوش جھلکتے تھے۔

"کیا بات ہے بہن؟ تم کون ہو؟ آؤ بیٹھو" شیر بانو نے نووارد لڑکی کا بڑے پیار سے استقبال کیا۔

"پیاسی ہوں بہن، پانی پلا دو۔" خشک دہن لڑکی نے بڑی منت سے کہا اور شیر بانو دوڑ کر لسی کا بھرا ہوا پیالہ لے آئی۔ لڑکی کا حلق تر ہوا تو گویا زندگی اس کے چہرے پر نکھر آئی۔

اس نے ممنون آنکھوں سے شیر بانو کی طرف دیکھا اور رخصت چاہی شیر بانو نے اسے بہ اصرار بٹھالیا۔ اس نے اس لڑکی سے یوسف کی خوشبو سونگھی تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کو یوسف کے ساتھ ضرور کچھ نسبت ہے "بہن کہاں سے آرہی ہو۔ اتنی نڈھال کیوں ہو؟" شیر بانو نے کریدتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"مجھے بندئی کہتے ہیں۔ میرا بھائی یوسف ہر روز شکار کھیلنے کرہ مار جاتا ہے۔ میں اسے دوپہر کا کھانا پہنچانے جایا کرتی ہوں، ابھی ابھی ادھر ہی سے آرہی ہوں۔ پیاسی تھی، مجبوراً تمہارا دروازہ کھٹکھٹایا۔"

"کون یوسف، ترلانڈی والے حسین کاکا کا بیٹا؟" یہ کہتے ہوئے شیر بانو کا دل دھڑکنے لگا۔

"ہاں بہن وہی" بندئی نے جواب دیا اور شیر بانو کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ "بندئی بہن، یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ تھوڑی سستا لو۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے، چلی جانا۔ اور ہاں یوسف خاں کو جب بھی کھانا دے کر لوٹو یہاں گھڑی دو گھڑی دم لے لیا کرو۔ خوش قسمت ہو بندئی بہن جو یوسف جیسا بھائی رکھتی ہو۔" اور باتوں ہی باتوں میں شیر بانو نے بندئی سے یوسف کے متعلق بہت کچھ پوچھ لیا۔

شیر بانو بڑی خوش تھی، اس نے گھر بیٹھے محبوب کو پالیا تھا۔ بندئی ہر دوپہر کو آتی اور شیر بانو اس سے یوسف کے متعلق ہی پوچھتی رہتی۔ جب یوسف کا ذکر ہوتا شیر بانو مسکراتی، اس کا دل بلّیوں اچھلنے لگتا۔ ذکرِ حبیب سے اس کے چہرے پر بہار کھل جاتی۔

بندئی کی زبانی جب پہلے پہل یوسف نے شیر بانو کی محبت اور اس کی والہانہ پرستش کا قصہ سنا، تو اس کے دل میں بھی میٹھی میٹھی گدگدی ہونے لگی۔ اسے پہلی بار اپنے روزمرہ کے اشغال میں کوئی داخل ہوتا محسوس ہوا۔ دوسرے دن جب شکار سے واپسی پر یوسف کی بے چین نگاہوں نے گاؤں کے ذرّے ذرّے کا جائزہ لیا تو یکبارگی اس کی نظر ایک موڑ پر جا کر رک گئی۔ پرشوق آنکھوں نے اس کا استقبال کیا، ہنستے ہوئے چہرہ نے اسے خوش آمدید کہی اور اس کی باز جیسی چمکتی اور کٹیلی نگاہوں کی مہمانی کسی نے اپنے دل و جگر سے کی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو محبت کے پیغام دئیے، عہد و پیمان کی گرہیں پڑیں۔ یہ میٹھی میٹھی آنچ دونوں طرف سلگنے لگی۔ محبت کی پینگیں بڑھتی گئیں،

اب یوسف صرف شکاری ہی نہیں شکار بھی تھا۔

ایک صبح حسبِ معمول یوسف کڑہ مار شکار کو گیا۔ سکندر آباد میں دبے چین نگاہوں نے سرِ راہے ایک دوسرے کا سلام لیا۔

یوسف کڑہ مار میں پہنچ کر اپنے روزمرہ کے مشاغل میں مصروف ہو گیا۔ وہ بظاہر شکار میں مصروف کڑہ مار کی جھاڑیوں اور چٹانوں میں محو تگ و دو تھا لیکن اس کا دل محبوب کے خیال میں محو تھا۔ گویا وہ چٹانوں، پتھروں اور لگردوں کے آس پاس شیر بانو کو تلاش کر رہا تھا۔ ہر پتھر پر اس فرہاد کو اپنی شیریں کی تصویر نظر آتی اور ایک لمحے کے لئے تو وہ اسے سچ مچ شیر بانو ہی سمجھ لیتا۔ اس کی طرف لپکتا لیکن فوراً ہی اسے احساس ہوتا کہ یہ خیال کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

اسی اُدھیڑ بن میں اس کا پاؤں ایک چٹان سے پھسلا اور کڑہ مار کے آسمان بوس لگر سے وہ ایک ایسی کھائی کی طرف تیزی سے گرنے لگا جس کی تہ میں موت اس کے سامنے منہ کھولے کھڑی تھی۔ اس نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، لیکن فضا میں کوئی چیز بھی اسے گرنے سے نہ روک سکی۔ آخر پتھروں کے سینے کو چیرتے ہوئے ایک درخت نے اسے سہارا دیا۔ اس نے بڑی مستعدی سے اس کی شاخ کو پکڑ لیا۔ وہ ہوا میں معلق تھا۔ اگر شاخ کو چھوڑدے تو نیچے بھیانک کھائی منہ کھولے اس کی منتظر تھی اور نہ چھوڑے تو کب تک ٹنگا رہے۔

مشرق کا کیمیاگر مغرب میں بیٹھ کر سونا بنانے لگا، افق کے کنارے طلائی ہوگئے اور در و دیوار پر گندھک ایسے سائے پھیل گئے، تو شیر بانو یوسف کے انتظار میں زلیخا کی طرح چشم براہ ہوگئی۔ آج وقت جا رہا تھا، لیکن یوسف کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اتنے میں دور گھنگروؤں کی آواز نے اس کے کانوں میں رس گھولنا شروع کیا۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا، یوسف آگیا، لیکن یوسف کہاں تھا؟ البتہ اس کے کتے بڑی پریشان حالت میں گاؤں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ آج ان کی آوازیں فریاد تھی۔ شیر بانو کا دل دھڑکنے لگا۔ "خدا خیر کرے! یا اللہ میرے یوسف کی خیر ہو!" اندھیرا چاروں طرف مسلط ہوگیا۔ شیر بانو نے رات جیسے انگاروں پر لوٹتے لوٹتے کاٹی۔ تمام رات یوسف کے کتے بڑی بھیانک آوازوں سے بھونکتے ہوئے آتے جاتے۔

شیر بانو سمجھ گئی کہ یوسف پر ضرور کوئی افتاد پڑی ہے۔

صبح کے سفید و براق پرندے نے ابھی اپنے اجلے اجلے پروں کو پوری طرح کھولا بھی نہیں تھا، فضا ابھی ملگجی ہی تھی کہ شیر بانو کے کان میں پھر کتوں کی آواز آئی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کوٹھے پر آئی کتوں کے پیچھے پیچھے بندی اور اس کی ماں ہانپتی کانپتی جا رہی تھی۔ شیر بانو کے ہاتھوں سے صبر کا دامن چھوٹا جا رہا تھا۔ اس کی رگ رگ میں الاؤ دہک رہے تھے وہ بھی ان کے پیچھے ہولی۔

یوسف کو کڑہ مار کے کنویں میں لٹکتا دیکھ کر ماں نے سینہ پیٹ لیا۔ بہن نے سر کے بال نوچ لئے اور شیر بانو تو جیسے بے روح مورتی تھی۔ یوسف لٹک رہا تھا، اس کی زندگی اور موت کے درمیان درخت کی صرف ایک شاخ حائل تھی۔ "اگر یہ درخت بھی نہ ہوتا!" شیر بانو نے سوچا "تو میرا یوسف موت کے بھیڑیے کے جنگل میں ہوتا اور موت کا بھیڑیا کسی پر رحم نہیں کرتا۔" اس خیال کے آتے ہی جیسے اس کے بدن سے کسی نے خون نچوڑ لیا، اس کا انار جیسا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا۔ یوسف نے ماں سے گلہ کیا "ماں تمہاری ممتا کو کیا ہو گیا تھا۔ اسے میری تکلیف کا احساس کیوں نہ ہوا؟"

"بیٹے میں نے تمام رات آنکھوں میں گذاری۔" ماں نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا۔ "اچھا تو بتاؤ ماں گذشتہ رات کتنی دفعہ بادل گھر کر آئے؟" لیکن یوسف کو ماں کے جواب سے تسلی نہ ہوئی۔ اس نے دوبارہ سوال کیا، لیکن اسے ماں کے جواب میں حقیقت کا سونا دمکتا ہوا دکھائی نہ دیا۔ اس کی ناکام آنکھوں نے اپنی معصوم بہن سے پوچھا اور جب وہاں سے بھی اسے مایوسی ہوئی تو اس کی مایوس آنکھیں شیر بانو سے چار ہوئیں جہاں خلوص اور محبت کے علاوہ شب فراق کی کلفتوں کے بے شمار افسانے بھی تھے اس کے آنسوؤں میں ہجر و فراق کی کلفتوں اور صعوبتوں کے دریا بند تھے۔ اس کی ڈھارس بندھ گئی۔ شیر بانو کے مرمریں ہاتھوں نے اپنے سر کی چادر یوسف کی طرف پھینکی۔ ماں کی ممتا بہن کے خلوص اور عشق و محبت کی کشش نے مل کر یوسف کو نئی زندگی عطا کی۔

محبت ذرے سے آفتاب اور قطرے سے سمندر بن چکی تھی۔ آخر وہ دن آیا کہ یوسف کی ماں

شیر بالو کا رشتہ مانگنے گئی۔ ترلا ندی کے بڑے ملک حسین کاکا کے شمشاد قد بیٹے اور اکلوتے وارث یوسف کے رشتے کو بھلا کون ٹال سکتا تھا؟ شیر بالو بھی اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی تھی، والدین نے سوچا جوڑا موزوں ہے لیکن تقدیر کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اسے دونوں کا خلوص اور محبت ابھی گوارا نہ تھا۔ شیر بالو کے چچیرے بھائی اس رشتے کے مخالف تھے۔ وہ شیر بالو پر خود قبضے کی سوچ رہے تھے انہوں نے چچا سے کہا شیر بالو یوسف زئیوں کی ناک ہے اور قبیلے کی ننگ و ناموس۔ یہ ہمارے قبیلے کی تمام عورتوں کے سر کا قیمتی دوپٹہ ہے جسے ہم معمولی قیمت پر نہیں دینگے اور قبیلے کی رسم کے مطابق شیر بالو کی قیمت طلب کی گئی تو وہ یوسف کے مال و ملک سے کہیں زیادہ تھی۔

عشق و محبت کے سوز سے نابلد لوگوں کی ذہنیت پر یوسف اور شیر بالو کو غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی، لیکن صدیوں کی قومی روایات اور قبیلے کی مقدس رسوم کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہی بنی۔ حسن و عشق کے درمیان قبیلے والوں نے سونے کی دیوار کھڑی کر دی تھی۔ پیار بھرے دو دلوں میں مال و زر کی ایک ایسی خلیج حائل ہو گئی تھی جسے مال و زر ہی پاٹ سکتے تھے۔ اس خلیج کو پاٹنے کے لئے یوسف کو کمر ہمت باندھنا پڑی، وہ ماں کی کوکھ کو جلتا، بہن کی محبت کو سلگتا اور شیر بالو کی امنگوں کو سسکتا ہوا چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا۔

اکبر اعظم کی فوج دریا موج میں یوسف نے تھوڑے ہی دنوں میں بڑا نام پیدا کر لیا اسے سپاہی سے افسر بنتے دیر نہ لگی، چند دنوں میں اس نے ترقی کر لی۔ یوسف کی ماں اور بہن، ناز و نعم کی پلی بہن اس کے چلے جانے پر بے کسی کی زندگی گزارنے لگی۔ ترلبوروں نے شکر کیا کہ یوسف چلا گیا وہ سمجھے اب وہ واپس کہاں آئے گا چند دنوں بعد انہوں نے مشہور کر دیا کہ یوسف مارا گیا اور اس طرح ساری جائداد پر خود قبضہ کر کے ماں بیٹی کو گھر سے نکال دیا شہزادیوں کی طرح زندگی بسر کرنے والی ماں اور بیٹی لوگوں کی خدمت کر کے زندگی کے دن گذارنے لگیں۔

شیر بالو زخمی کونج کی طرح ہجر و فراق کے لمحات تڑپ تڑپ کر گزارنے لگی اور جب اس کا باپ مر گیا تو اس کے رہے سہے حواس بھی کھو گئے۔ اب تو اس کا وسیع اور عریض

گاؤں، اس کے ہرے بھرے کھیت اس کے لئے قفس کی طرح تھے اب وہ اپنے چچازاد بھائیوں کے ظلم و جور کا شکار تھی۔ شیر بالو کے کان میں یہ بھنک پڑی کہ اس کے چچازاد بھائیوں کی نیت میں فتور ہے، وہ اسے پر کٹے پرندے کی طرح ذبح کرنا چاہتے ہیں، وہ اس پر ہر ممکن ظلم کریں گے یہاں تک کہ اس کی شادی بھی کسی اور کے ساتھ کر دیں گے، وہ کانپ اٹھی اور اپنے دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ اس کا ہاتھ اگر کسی دوسرے کے ہاتھ میں دیا گیا تو وہ زہر کھا لے گی۔

اور پھر وہ منحوس گھڑی بہت جلد آگئی جس میں ڈھولک ٹمرنا نے شیر بالو کی شادی کا اعلان کر دیا۔ شیر بالو پر غم و الم کا آسمان ٹوٹ پڑا اس نے کسی نہ کسی طرح بندئی کو بلوا بھیجا۔ بندئی بہن، اس بھری دنیا میں میرا تیرے سوا کوئی نہیں۔ بہن اگر تو مجھے تھوڑا سا زہر لا دے تو بڑا احسان ہوگا۔ میں نہیں چاہتی کہ یوسف کے علاوہ کسی اور کے گھر جاؤں۔ وہ کہے گا شیر بالو بے وفا نکلی۔ یہ لے میرا سونے کا پیزدان۔ اسے بیچ ڈال تاکہ میری پاک محبت پر حرف نہ آئے۔ بہن جلدی اثر کرنے والا زہر لانا۔"

"شیر بالو بہن، تو نے تو میری مشکل بھی حل کر دی۔ زہر میں مجھے بھی شریک کرنا اب تو میں بھی زندہ رہنا نہیں چاہتی، میرا شہزادہ بھائی یوسف نہیں ہے، تو میں اب کیا کروں۔" اور بندئی دوسرے دن زہر لانے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

نقارے بج رہے تھے ڈھول سُرنا کی چیخم دھاڑ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایک طرف چولھوں پر بڑی بڑی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور بندئی ان دیگوں کے لئے پانی ڈھونڈ رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو اور لب پر یوسف کا نام۔ وہ بھائی سے شکایت کر رہی تھی کہ وہ ایسا گیا کہ اپنی بہن کی خبر تک نہ لی۔ اسی محویت میں ایک گھڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرا، گھڑا ٹوٹ گیا۔ باورچی نے اس حرکت پر اسے گھرکا۔ اس کا پیمانۂ صبر لبریز تو تھا ہی، بے اختیار چھلک پڑا۔ وہ ایک طرف جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ——— "اے بھائی، اے میرے یوسف بھائی! اے گاؤں کے سردار بھائی، آ دیکھ تیری ناز و نعم کی پالی بہن کو کیا کیا دکھ

جھیلنے پڑ رہے ہیں۔" میلے کچیلے دوپٹے کی سلوٹوں میں اس کے آنسو جذب ہو گئے۔ بے حس دوپٹہ ان آنسوؤں کی قدر و قیمت کیا جانے!

"بندی بہن!" کسی نے اسے پکارا اور اسے فوراً شیر بانو کا وعدہ یاد آگیا۔ "زہر" اس خیال نے جیسے اس کے سینے سے ایک بھاری پتھر ہٹا دیا۔ اب اسے ان مصیبتوں سے نجات مل جائے گی۔ وہ آنسو پونچھتی ہوئی اٹھی۔ "بندی بہن رو کیوں رہی ہو؟ میں آگیا ہوں۔" جب بندی نے یوسف کو اپنے سامنے کھڑا پایا تو چیخ مار کر بھائی کے ساتھ لپٹ گئی، خوشی کے اس عالم میں وہ کبھی ہنستی کبھی روتی۔

"یہ سب کیا ہے بندو؟" یوسف نے دیگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری بہن اب حسین کاکا کی بیٹی نہیں، ایک خدمت گار ہے۔ میرے یوسف بھائی یہ سب شیر بانو کی برات کا سامان ہے اور میں یہاں مزدوری کر رہی ہوں۔"

"فکر نہ کرو بہن، یوسف اب صرف شکاری یوسف نہیں رہا بلکہ وہ وقت کے بہت بڑے حاکم اکبر اعظم کی فوج کا ایک اعلیٰ افسر بھی ہے۔ میں چھٹی لے کر آیا ہوں، میرے ساتھ میرے سپاہی بھی ہیں، تم جا کر شیر بانو کو خوش خبری سنا دو کہ یوسف ہندوستان سے اپنے ساتھ بہت سی دولت لے کر آگیا ہے اور برات کے چاول اسی کے براتی کھائیں گے، اور پھر جب عین وقت پر قاضی صاحب نکاح پڑھنے ہی والے تھے، یوسف نے اپنے مسلح سپاہیوں سمیت حملہ کر دیا، برات میں بھگدڑ مچ گئی، پہلے تو کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو گیا۔ اور پھر یوسف کو فوج کے ساتھ دیکھ کر یہ لوگ سوچ میں پڑ گئے کہ یہ سب خواب ہے یا بیداری۔

دشمنوں میں سے جس نے مقابلے کی کوشش کی اسے تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یوسف بھی سارے گاؤں کے ساتھ لڑنا نہیں چاہتا تھا اس نے اپنے حریفوں ہی سے انتقام لیا اور جب میدان صاف ہو گیا تو وہ خلوص و محبت بھرا دل لیکر شیر بانو کے حضور آپہنچا۔ ایک لمحہ تو دونوں ایک دوسرے کو اس طرح خاموش دیکھتے رہے جس طرح دو تصویریں آمنے سامنے رکھ دی ہوں اور جب پھر سکوت ٹوٹی تو دونوں کی آنکھوں کی سیپیوں میں محبت کے موتی بھر گئے، گلوں شکووں کے دفتر کھل گئے۔

گاؤں والوں نے مل کر اپنے بہت بڑے سردار حسین ملک کے بیٹے یوسف کو خوش آمدید کہی، انہیں خوشی ہوئی کہ حسین ملک کا نام زندہ رکھنے والا زندہ ہے۔ شیر بانو کو حسین ملک کی بہو بنا کر لایا گیا اور بندی نے ایک اچھی نند کی طرح اس کا استقبال کیا۔ یوسف نے اپنے گاؤں سے پرے الگ ایک دنیا بسائی کڑہ مار پہاڑ کی چوٹی پر اپنی شکار گاہ میں، جہاں اسے شیر بانو کے دوپٹے نے موت کی بھیانک کھائی سے نکالا تھا۔ یوسف کو الگ تھلگ دنیا پسند تھی، وہ اسی دنیا میں شکار بھی کھیلتا اور اپنی محبوبہ کے ساتھ راز و نیاز بھی کرتا۔

ایک دن اچانک بندی بیمار ہو گئی۔ یوسف کو بہن بڑی عزیز تھی، اس نے دنیا جہان کے طبیبوں سے علاج کروایا، گنڈے تعویذ کئے، لیکن بندی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ان کا ایک عزیز ساتھی زندگی کے طولانی سفر میں ان کا ساتھ چھوڑ گیا، لیکن یوسف کی دنیا آباد تھی۔ شیر بانو اس کی سب کچھ تھی۔

ایک دن شیر بانو کو بخار آ گیا۔ یوسف کا دل دھک سے رہ گیا۔ اب کیا ہو گا؟ اس کو چاروں طرف بھیانک کھائیاں منہ کھولے ڈرانے لگیں۔ اس نے اپنے آپ کو درخت سے معلق پایا اور پھر یوسف سچ مچ دیوانہ ہو گیا۔ جب شیر بانو کی جوانی نے اس کی آغوش میں دم توڑ دیا!

کڑہ مار کی شکار گاہ سونی ہو گئی، چہل پہل کو کسی کی نظر کھا گئی۔ اب یوسف بے خود پڑا رہتا۔ اس نے دنیا تج دی تھی، وہ ایک دیوانہ تھا مجذوب تھا۔ شیر بانو کی قبر کا مجذوب مجاور، دیوانہ جاروب کش اس کی زبان پر شیر بانو کے گیت اور ٹپے تھے اور انہی ٹپوں کی ایک اونچی الاپ کے ساتھ ایک دن اس کی روح کا طائر جسم کے پنجرے کو توڑ کر نکل گیا!

کڑہ مار کی چوٹی اس کا ہر نشیب و فراز اس کا پتہ پتہ اور بوٹا بوٹا محبت کے ان مجسموں کی زندہ یادگار ہے اس دنیا میں دو قبریں، سکندر آباد کی شہزادی شیر بانو اور ترلا ندی کے شہزادے یوسف کے خاکستری جھلے ان کی آخری آرام گاہ ہیں — ان میں محبت کے خزانے مخفی ہیں، اس جگہ کو نہ تو سکندر آباد کہا جاتا ہے اور نہ ترلا ندی۔ یہ مقام اب یوسف کڑہ مار کی زلیخا شیر بانو کے نام کی بنا پر شیر غونڈئی کے نام سے مشہور ہے ؛

شہی تور دِلئی

رضا ہمدانی

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہندوستان میں مغل شہنشاہ اکبر اعظم کا طوطی بول رہا تھا سارے برعظیم میں اس کا سکہ رواں تھا مغل پھریرا ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر لہرا رہا تھا اور ہر طرف مغل آرٹ، قوت اور تلوار کے چرچے تھے۔

انہیں دنوں اٹک کے اس پار پشتونوں کے دو مشہور قبیلوں یوسف زئی اور مندڑ میں باہمی رقابت چل رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے معمولی معمولی باتوں پر خون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں۔

یوسف زئی قبیلے کے دو چچیرے بھائی تور دلئی اور منوّر کی آپس میں بڑی دوستی تھی۔ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ سارے قبیلے میں ان کا اتحاد ضرب المثل بن گیا تھا چچیرے بھائیوں میں اتنی دوستی تربوروں میں ایسا اتفاق۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ نہ چل سکا اور جلد ہی ان کی دوستی دشمنی میں بدل گئی جیسے ان کی محبت کو زمانے کی نظر کھا گئی۔ والدین کی وفات کے بعد زمین کی تقسیم نے ان کے خلوص کو گہنا دیا اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف مخالفانہ جذبات ابھر آئے۔

تور دلئی کو شکار سے بڑی رغبت تھی۔ اس کا زیادہ وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکار کی تلاش میں جنگلوں اور پہاڑوں میں گزرتا تھا۔ اس کی طبیعت میں آوارگی تھی۔

گاؤں میں اس کا جی نہ لگتا تھا۔

ایک دن جب وہ شکار کی تلاش میں تھے اچانک ان کے راستے میں ایک ایسی چراگاہ آگئی جو مندڑ قبیلے کی ملکیت تھی۔ توردلئی کے لئے اسے عبور کرنا ناگزیر تھا۔ اس کے ساتھیوں نے چراگاہ میں داخل ہونے پر لوٹ جانے کو ترجیح دی۔ انہیں معلوم تھا کہ مندڑوں کی چراگاہ میں قدم رکھنے کا مطلب قبیلے کو جنگ کی دعوت دینا ہے لیکن توردلئی نے ساتھیوں کے مشورے پر عمل نہ کیا اور کہا "دیکھا جائے گا۔"

جب مندڑوں کو ان کے چرواہے نے یہ خبر دی کہ یوسف زئیوں نے ہماری چراگاہ پر ہلہ بول دیا ہے تو ان کی تلواریں نیام سے تڑپ کر باہر آگئیں قبیلے میں جنگ کا نقارہ بج گیا۔ بچہ بچہ مسلح ہو کر چراگاہ کی طرف لپکا۔ عورتوں نے گھر کا کام کاج چھوڑ کے پانی کے مشکیزے کندھوں پر ڈال لئے۔ "یوسف زئیوں کی یہ جرأت کہ مندڑوں کے منہ آئیں، انہیں مزہ چکھا دیا جائے گا۔"

مندڑوں کی چراگاہ آن کی آن میں انسانوں کے خون کی جھیل بن گئی۔ توردلئی کے چند ساتھی آخر کب تک مقابلہ کرتے، مندڑوں کے لاؤ لشکر نے انہیں کاٹ کر رکھ دیا۔ توردلئی زخموں سے چور ہو چکا تھا، پیاس کی شدت سے اس کی زبان پر کانٹے پڑ چکے تھے۔ دشمنوں کے ہجوم میں وہ کس سے پانی مانگتا۔ وہ تو اس کے خون کے پیاسے تھے اتنے میں ایک عورت کندھے پر مشکیزہ ڈالے اس کے قریب سے گزری۔ توردلئی کے منہ سے بے اختیار نکلا "پانی" اور جب عورت نے اسے پانی کا مشکیزہ دیا تو اس حسین و جمیل دوشیزہ سے آنکھیں چار ہوتے ہی توردلئی کے ہاتھوں سے مشکیزہ گر کر زمین پر آ رہا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور نظریں دوشیزہ کے چہرے پر گڑ گئیں۔

"کیا بات ہے اجنبی؟ تمہارے ہاتھوں میں مشکیزہ تھامنے کی قوت نہیں تو تلوار کیسے چلاؤ گے یوسف زئی ہو نا" دوشیزہ نے طنز کا ایک نشتر چبھوتے ہوئے توردلئی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں خاتون"۔۔۔ توردلئی نے چونک کر کہا۔

"یہ لو اور پانی۔ میری طرف دیکھنے سے بہتر ہے کہ تم پانی پی لو۔ مندڑ اپنے دشمن کو پیاسا

نہیں دیکھ سکتے۔"

"پانی تو پی چکا ہوں لیکن پیاس اتنی بڑھ گئی ہے کہ اب اسے دریا بھی نہیں بجھا سکتا۔"

"اگرچہ مجھے یوسف زئی کے نام سے نفرت ہے لیکن میں اس دشمن کی بھی قدر کرتی ہوں جس کی پیٹھ پر زخم نہ ہو۔ اسی لئے میں نے تجھے بہادر جان کر پانی دیا لیکن تیری باتوں سے تو بزدلی کی بو آرہی ہے۔"

"میں یوسف زئی قبیلے کا شیر دل جوان ہوں، اپنے قبیلے کی آن پر کٹ مرنے والا۔ میں مندڑوں کے ان گیدڑوں کو خاطر میں نہیں لاتا جنہوں نے جھاڑیوں میں چھپ کر ہم پر حملہ کیا، میرے تیر میں ہزاروں مندڑوں کے سینے چھلنی کرنے کی قوت ہے لیکن آج میں تیری پلکوں کے تیروں کا مقابلہ نہیں کر سکا۔"

"نوجوان ہوش میں آؤ۔ یہ جنگ کا میدان ہے، اس میں تلوار چلتی ہے، ٹپے نہیں گائے جاتے۔ اگر ٹپے ہی گانے ہوں تو اپنے حجرے میں بیٹھ کر گانا۔"

"جنگ اور محبت دونوں نے ایک دوسرے کو جنم دیا ہے۔ میری آنکھوں میں تیرے لئے محبت کی چراگاہیں آباد ہیں۔ کیا میں تیرا نام دریافت کر سکتا ہوں۔"

"میرا نام شہی ہے۔ تم کتنے بے خبر ہو نوجوان۔ مجھے نہیں جانتے، میں مندڑوں کے سردار مستجاب خان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔"

جب لڑائی ختم ہو گئی تو یوسف زئی قبیلے کے سرداروں نے جرگہ جمع کیا تاکہ جنگ کے اسباب معلوم کئے جائیں اور پتہ لگایا جائے کہ یوسف زئیوں کے جو نوجوان اس حادثے میں کام آئے ہیں ان کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔

منوّر نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اس لڑائی کا ذمہ دار تور دلئی کو ٹھہرایا۔ جرگے نے فیصلہ کیا کہ تور دلئی کی وجہ سے قبیلے کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی پاداش میں اسے گاؤں سے نکال دیا جائے۔

تور دلئی اپنے گاؤں کے نوجوانوں کا سردار تھا، وہ حجرے کی زینت تھا، اس نے

گاؤں چھوڑا تو یوسف زئی قبیلے کے جوانوں کا ایک خاصا گروہ اس کے ساتھ ہو لیا اور یہ سب کے سب پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے لگے۔ تور دلئی کو جرگے کے اس نامنصفانہ فیصلے پر بڑا دکھ ہوا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ منور نے کرایا ہے تو آتش انتقام کے شعلے اس کے روئیں روئیں سے نکلنے لگے اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ امن کی زندگی ترک کر کے ڈاکو بنے گا۔ جب جرگے بے انصافی پر اتر آئے جب بڑے بوڑھے حق تلفی کرنے لگیں تو کیوں نہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ اب تور دلئی بہت بڑا ڈاکو بن چکا تھا۔ اس تصور نے منور کی زندگی تلخ کر دی اسے تور دلئی کے انتقام سے خوف محسوس ہونے لگا۔

ایک عرصہ تک تور دلئی اسی دھن میں لگا رہا وہ ڈاکے ڈالتا، قتل و غارت کرتا، اس کے ضمیر نے اسے ملامت نہ کی وہ دن دہاڑے لوٹ مار کرتا اور اپنے غاروں میں ساتھیوں کے ساتھ جشن مناتا لیکن اس عرصے میں اس کے دل میں جو چیز کانٹا بن کر کھٹکتی رہی وہ شہئی کی یاد تھی۔ یہ خلش اسے ہر وقت ستاتی۔ شہئی کو اپنانے کی اسے کوئی صورت نظر نہ آتی۔ اس نے چاہا کہ وہ اسے اغوا کر لائے لیکن اس نے اپنے بازوؤں میں وہ قوت نہ پائی جس سے منڈروں کا مقابلہ کر سکے اور جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور ضبط کا یارا نہ رہا تو ایک دن خود بخود مستجاب خان کے حجرے میں داخل ہوا۔ اسے مہمان سمجھ کر خوش آمدید کہی گئی۔ خان نے اسے چارپائی پر اپنے برابر جگہ دی اور نوکر سے کہا مہمان کے لئے تکیہ لاؤ اور لسی کا ایک کٹورا بھی۔

"مہمان تم کہاں سے آئے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ ہم تمہاری مدد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔"

"میں صرف آپ کے سلام کے لئے آیا ہوں، مجھے تور دلئی کہتے ہیں۔"

"تور دلئی!" مستجاب خان ایک دم چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور تلوار نیام سے نکال لی۔ "ڈاکو، چور، خونی۔ تم کس نیت سے یہاں آئے ہو؟ اگر تم میرے حجرے میں نہ ہوتے تو تمہیں میری تلوار سے دنیا کی کوئی طاقت نہ بچا سکتی۔"

"میں ڈاکو ہوں ملک بابا لیکن یہاں ڈاکو کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مظلوم فریادی بن کر آیا ہوں۔"

مستجاب خان کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ تلوار نیام میں چلی گئی، وہ مطمئن ہو کر چار پائی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ ہم مظلوم کی ہر مدد کرنے کو تیار ہیں چاہے وہ ہمارا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔"

"خان بابا یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ڈاکہ زنی میرا پیشہ نہیں، مجھے حالات نے ایسا بننے پہ مجبور کر دیا۔ منور نے جرگے والوں کو ورغلا کر مجھے گاؤں سے نکلوا دیا۔ میری زمین پر خود قابض ہو گیا اور مجھے ڈاکو بننے پر مجبور ہونا پڑا۔"

"اگر تم ٹھیک کہتے ہو تو تم پر واقعی بڑا ظلم ہوا ہے، میں تو آج تک اندھیرے میں تھا، مجھ سے تو کچھ اور ہی کہا جاتا رہا۔ نور دلئی مجھے تم سے ہمدردی ہے اور میں تمہاری ہر مدد کرنے کو تیار ہوں۔"

"خان بابا۔ میرا آپ کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ اگر آپ مجھے اپنی فرزندی میں قبول کر لیں تو میں عمر بھر آپ کا احسان نہیں بھولوں گا۔"

خان اس پر چونک اٹھا اور بولا ہوش کی دوا کرو نور دلئی۔ یوسف زئی اور منڈر کا رشتہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں قبیلے کا سردار ایسی حرکت کروں تو جرگے کو کیا جواب دوں گا۔"

"لیکن خان بابا میں تو آپ ہی کے پاس رہنا چاہتا ہوں، آپ کی دولت آپ ہی کے گھر رہے گی۔"

یہ سن کر مستجاب خان ایک گہری سوچ میں غرق ہو گیا ایک طرف نوجوان بہادر نور دلئی تھا جس سے بہتر رشتہ اسے یقیناً اپنی اکلوتی بیٹی شہی کے لئے نہیں مل سکتا تھا۔ دوسری طرف قبیلے کی عزت، جرگے کا خوف، عداوت، پختو، ایسی چیزیں تھیں جس کی وجہ سے یہ رشتہ ناممکن سی بات تھی۔ اور جب ملازم لسی کا کٹورہ لے کر آیا تو مستجاب خان نے چونک کر کہا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے نور دلئی۔ تم میرے مہمان ہو، میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا خواہ اس کے لئے مجھے بڑی سے بڑی مشکل کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔"

تور دلئی نے اٹھکر مستجاب خاں کے گھٹنے چھوئے اور ڈاکہ زنی سے ہمیشہ کے لئے توبہ کرکے خان کے پاس رہنے لگا۔ وہ خوش تھا کہ اس کے دل کی مراد بر آئی۔ اپنی محبوبہ کے انگارہ ایسے رخسار اور پھول جیسے شبرنگ گیسوؤں کے ٹھنڈے سائے پاکر وہ زمانے کا کا سرد و گرم بھول چکا تھا۔

منور کو اس بات کا علم ہوا تو وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس نے سوچا تور دلئی کا مستجاب خان کی لڑکی سے رشتہ طے پا گیا تو وہ بڑی طاقت پکڑ جائے گا اور اس کے لئے مستقل خطرہ بن جائے گا، اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ ابھی اور اسی وقت اس کا سر کچل دیا جائے چنانچہ وہ موقع کی تلاش میں رہا اور ایک دن جنگل میں اکیلا پاکر اپنے ساتھیوں سمیت جا کر اسے گھیر لیا۔ اکیلا تور دلئی کس کس کا مقابلہ کرتا۔ قریب تھا کہ منور کی تلوار اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی کہ میں مستجاب خاں اطلاع پاکر اپنے آدمیوں سمیت آپہنچا اور ایک خونریز لڑائی کے بعد منور کو بھاگنا پڑا۔

شہی، تور دلئی کی محبت کا زخم میدان جنگ سے لے کر آئی تھی اور اب تک اسے ایک مقدس امانت کی طرح اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھی۔ وہ تور دلئی کو بے حد چاہتی تھی، وہ جب بھی اسے دیکھتی اس کے جذبات میں جوار بھاٹا کی کیفیت پیدا ہو جاتی، اس کی نس نس میں رباب کی طرح ٹپے الاپنے لگتی، اس کا رُواں رُواں گیت گانے لگتا لیکن اس بے پناہ محبت کے باوجود ایک بات اسے گھن کی طرح کھا رہی تھی اور وہ یہ کہ تور دلئی ڈاکو رہ چکا تھا اپنے بیگانوں کے طعنوں کے خیال سے اس کا دل کانپ جاتا اور اسے تور دلئی سے نفرت ہونے لگتی۔

پھر وہ سوچتی کہ اس کی شادی ہو گئی تو قبیلے کی عورتیں اس پر آوازے کسیں گی، اس پر انگلیاں اٹھائیں گی اور اسے جینا دو بھر ہو جائے گا۔ کہاں یوسف زئی ڈاکو اور کہاں منڈروں کی شہزادی — سوچتے سوچتے اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا، وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی یہاں تک کہ وہ اپنی جان سے بیزار نظر آنے لگی۔

آخر ایک دن اس نے فیصلہ کن انداز میں ماں سے کہا۔ "ماں میں تور دلئی سے شادی نہیں کروں گی" ماں نے اٹھکر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بدتمیز لڑکی، تجھے شرم

نہیں آتی، یہ آج تو کیسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہے۔"

"ماں وہ چور ہے، ڈاکو ہے، خونی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یوسف زئی ہے۔ ہمارے قبیلہ کا دشمن۔ ماں ہم لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

"خاموش۔ اپنے منگیتر کے خلاف زبان کھولتے تجھے حیا نہیں آتی؟ کیا اپنے باپ کے شملے کو خاک میں ملانا چاہتی ہے؟ خبردار جو آئندہ تیرے منہ سے ایسی بات نکلی۔ کہیں باپ نے سن لیا تو تیری زبان کھینچ لے گا۔ مستجاب خان کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات ہر قیمت پر پوری ہو کر رہتی ہے۔ نوردلئی یوسف زئی سہی لیکن اب وہ ہمارا ہو چکا ہے۔ اور پھر منڈروں اور یوسف زئیوں میں ایسا فرق بھی کیا ہے، دونوں چچازاد بھائی ہی تو ہیں۔ یہ تو تربور ولی کا برا ہو جس نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا رکھا ہے۔ بیٹی وہ ڈاکو نہیں اچھے خاندان کا لڑکا ہے۔ اس کی جائداد ہے زمین ہے، خاندان ہے اپنے پرائے ہیں۔ یہ تو دشمنوں نے اسے کہیں کا کہیں پہنچا دیا تھا اور اب تم دیکھتی ہو وہ سب برے کام چھوڑ کر کتنا نیک بن چکا ہے۔"

"نوردلئی جو دروازے کی اوٹ سے ماں بیٹی کی گفتگو سن رہا تھا یکایک اندر آ گیا اور کہنے لگا "شہی میں ڈاکو نہیں، میں نے جس دن سے مستجاب خاں کے حجرے میں قدم رکھا ہے، اسی دن سے سب برے کام چھوڑ دیئے ہیں۔ میں نے تمہارے لئے سب کچھ چھوڑ دیا ہے، اپنا خاندان اور قبیلہ بھی چھوڑ دیا ہے۔"

شہی کے چہرے کو شرم و حیا کے سرخ آنچل نے ڈھانپ لیا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا اور مارے ندامت کے عرق عرق ہو گئی۔

"نوردلئی مبارک ہو تمہیں، دشمن اپنی موت آپ مر گیا" مستجاب خان نے مکان میں داخل ہوتے ہی مسکراتے ہوئے کہا۔

"کون دشمن بابا؟" نوردلئی نے حیرت سے پوچھا۔

"منور ادو کون"

"وہ کیسے بابا؟"

"ہاشم خبر لایا ہے کہ منور نے شہنشاہ اکبر کی فوج میں نوکری کر لی ہے اور گاؤں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔"

"خوب خوب! کمبخت نے کانٹے بوئے تھے، جو کیسے کاٹ سکتا تھا۔ مجھے اپنے گھر بار اور کھیت کھلیان سے نکالا، خدا نے اسے بھی پردیس کے جہنم میں دھکیلا۔ اب پرائی چاکری کرے، در در کی ٹھوکریں کھائے گا تو قدرِ عافیت معلوم ہوگی اسے۔" نور دلی نے نفرت بھرے انداز میں کہا۔

"بیٹا! اگر وہ سچ مچ گاؤں چھوڑ گیا ہے تو تمہاری شادی میں کوئی دیر نہیں، میں نے تمام انتظام مکمل کر رکھا ہے۔"

دوسرے دن منور کے بھرتی ہونے کی تصدیق ہوتے ہی نور دلی کی شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ منڈروں کے سردار کی اکلوتی بیٹی کی شادی تھی۔ ہر گھر میں مسرت کے شادیانے بجنے لگے، ہر آنگن میں "اتن ناچ" کے رومانی دائرے سبز، سرخ، اودے اور سرمئی آنچلوں کی قوس قزح بنا رہے تھے۔ حجروں میں منڈروں کے شمشاد قد جوان گھڑے کے ساز پر ٹپے گا رہے تھے، رباب کی دھنوں کی زبان سے محبت کی داستان سرائی ہو رہی تھی۔ ڈھولک سُرنا کی جوشیلی تانوں پر بلبلہ اور شاڈولا ناچ ناچا جا رہا تھا۔ غرض منڈروں کی سرزمین کے چپّے چپّے پر یوں خوشیاں منائی جا رہی تھیں جیسے عید کا چاند نکل آیا ہو۔

شہی کے دل میں محبت کی دھڑکنیں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ جب اسے خیال آتا کہ وہ آج کل میں نور دلی کی ہو جائے گی اور پھر وہ دونوں اپنی دنیا کے راجہ رانی ہوں گے تو اس کا چہرہ ایک نشیلی اور لذیذ گرمی محسوس کرتا اور پسینے کے قطرے اس کی چاند ایسی پیشانی سے پھوٹ کر ستواں ناک پر آ جاتے اور پھر سونے کے چمکتے ہوئے پیزوان میں آکر موتی کی طرح اٹک جاتے۔

"کیا سوچ رہی شہی؟" نور دلی کی آواز سے شہی چونک کر جھینپ سی گئی۔ اس نے جلدی سے دوپٹے کو سر پر کھینچ لیا جو ڈھلک کر اس کے شانوں پر آ گرا تھا۔

"کوئی بات نہیں بس یونہی بیٹھی ہوں۔ لیکن تم آج بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔ بات کیا ہے؟"

"خوشی کا آج کیا ٹھکانہ ہے شہی۔ ایک تو ترلور اپنی ہار مان کر بھاگ گیا، دوسرے مجھے

میرے خوابوں کی وہ ملکہ ملنے والی ہے جس نے برسوں سے میری نیند حرام کر رکھی تھی۔شہی تم کیا جانو کہ تمہیں پانے کے تصور سے میرے دل کی کیا کیفیت ہے۔یہ چند گھڑیاں میرے لئے پہاڑ بن گئی ہیں۔"

"درست ہے میرے لٹیرے محبوب! تمہاری خوشی بجا ہے لیکن میں سمجھی تھی کہ تم جا تنے زیادہ خوش ہو تو شاید میرے لئے شہنشاہ اکبر کی رانی کا ست لڑا ہار لے آئے ہو۔" شہی نے حسب عادت طنز کا ایک زہریلا تیر پھینکا۔

شہی کے اس طنز نے نور دلئی کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔اس کی رگ رگ میں سوئی ہوئی یوسف زئی غیرت اور ہٹ ایکدم جاگ اٹھی، اس کا دماغ ہنڈولے کی طرح گھومنے لگا، اس نے دیکھا کہ وہ شہنشاہ اکبر کے محل میں کھڑا ہے، سامنے تخت پہ ملکہ بیٹھی ہے، اچانک وہ جھپٹ کر تخت پر چڑھ گیا اور ایک ہی جھٹکے میں ست لڑا ہار ملکہ کے گلے سے چھین کر لے آیا۔

"تم سوچ میں پڑ گئے۔خیر کوئی بات نہیں، آج نہ سہی کل لے آنا ہار، اتنی جلدی بھی کیا ہے؟" شہی شرارت آمیز چٹکی لیتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔"مندڑوں کی ملکہ تو واقعی ست لڑے ہار کے قابل ہے، اب میں نے عزم کر لیا ہے کہ تیری فرمائش پوری کر کے ہی دم لوں گا۔ اگر اس امتحان میں کامیاب نہ ہو سکا تو مجھے معاف کر دینا۔میری شہی۔خدا حافظ!"

شہی جیسے گہری نیند سے چونک اٹھی۔اپنے چونچلوں کا یہ خوفناک نتیجہ دیکھ کر وہ بدحواس ہو گئی۔"میرے سرتاج، میرے سرتاج! مجھے ست لڑا ہار نہیں چاہئے۔واپس آجاؤ، خدا کے لئے واپس آجاؤ، میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں"۔ وہ بے اختیار ہو کر پاگلوں کی طرح چلانے لگی۔لیکن آہ نور دلئی جا چکا تھا!

شہی کے حسین خوابوں کی مالا ٹوٹ گئی اور اس کا دانہ دانہ بکھر گیا۔مندڑوں کی بستی میں قہقہوں کا گلا گھونٹ دیا گیا۔رباب کے تار شل ہو گئے گھنگروؤں کے چھناکوں نے دم توڑ دیا۔مستجاب خاں کا ہنستا بولتا چہرہ اداسیوں میں ڈوب گیا۔"کیا کر دیا تو نے شہی یہ کیا کر دیا؟ ―― بیوقوف لڑکی تو نے اپنے ہاتھوں اپنا سہاگ اجاڑ دیا۔باپ کی کمر توڑ دی۔قبیلے کی ناک کاٹ

دی۔ آہ۔ آہ۔ مستجاب خاں غش کھاکر گر پڑا اور جب اسے ہوش آیا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا، چہرے کی جھریاں گہری ہوگئیں اور وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا دکھائی دینے لگا۔

شہتی ــــ ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج کی طرح اکیلی پڑی کرلا رہی تھی۔ وہ فراق کی آگ میں بھُنے لگی۔ نور دلئی سچ مچ کا لٹیرا نکلا، اس کے اطمینان کی دولت غارت کرکے چل دیا۔ اسے ایک پل بھی آرام نہیں تھا، وہ اٹھتے بیٹھتے نور دلئی کے خیال میں مگن رہتی، وہ اس کے خوابوں میں بس گیا تھا۔ وہ دیکھتی کہ نور دلئی دشمن کی فوج میں گھر گیا ہے اور وہ اس پر تلواروں اور تیروں کی بوچھاڑ کررہے ہیں۔ ایک دفعہ اس نے دیکھا کہ نور دلئی اکبر بادشاہ کے قلعہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ سپاہیوں نے اسے گرفتار کرلیا۔ وہ چیخ مار کر جاگ اٹھی ــ ماں نے تسلی دی "نور دلئی بڑا بہادر ہے، اسے بڑی سے بڑی فوج بھی نہیں پکڑ سکتی۔ گھبراؤ نہیں وہ جلدی لوٹ آئے گا۔"

ایک رات جب چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، آسمان سے تاریکیوں کے قافلے اتر رہے تھے، منڈروں کی ساری بستی نیند کے جزیرے میں اتر چکی تھی۔ شہتی بدستور اپنے محبوب کے خیال میں کروٹیں لے لے کر صبح کا انتظار کررہی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی ــ شہتی کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی ــ خدا خیر کرے اتنی رات گئے کون آیا ہے۔ کہیں میرا نور دلئی نہ ہو ــ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ مستجاب خاں نے دروازہ کھولا ــ "بھگوان داس! اس وقت تم کہاں خیر تو ہے۔ آؤ بیٹھو دوست، کہو کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے نا؟" مستجاب خاں نے گھبراہٹ کے عالم میں اپنے دوست سے پوچھا جو اٹک کے قلعہ سے آیا تھا۔

"گھبراؤ نہیں خان" ــ بھگوان داس نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہارا چہرہ تمہارے دل کا ساتھ نہیں دے رہا۔ وہ کوئی ایسی بات کہنا چاہتا ہے جو تم چھپانے کی کوشش کررہے ہو۔ دوست جلدی کہو ــ خدا کے لئے دیر نہ کرو، میں بری سے بری خبر سننے کو تیار ہوں۔"

"خان نور دلئی کو شہنشاہ کے سپاہیوں نے گرفتار کرلیا ہے۔"

"وہ کیسے پکڑا گیا تھا اس نے؟"

وہ شاہی محل میں نقب لگا رہا تھا۔ شہنشاہ نے اسے موت کی سزا دے دی

بھگوان داس نے دھڑکتے ہوئے دل اور آبدیدہ آنکھوں سے یہ بات کہی۔ شہتی یہ سنتے ہی چیخ مار کر بیہوش ہوگئی۔ گھر میں واویلا مچ گیا۔ بھگوان داس نے پوچھا یہ شور کیسا ہے اور چیخ کس کی تھی؟

"بدنصیب شہتی کو غش آگیا ہے۔ وہ تور دلئی کی منگیتر ہے۔ کاش یہ اسے ست لڑے ہار کا طعنہ نہ دیتی!" شکستہ دل متجاب خاں نے دل تھام کر بمشکل یہ فقرے ادا کئے۔

"شہتی میری بھتیجی" بھگوان یہ کہکر اٹھا اور دوڑ کر شہتی کے پاس پہنچا اور اس کے سر پہ پیار کرتے ہوئے بولا "بٹیری گھبراؤ نہیں۔ بھگوان داس اپنی بیٹی کے لئے پہاڑ سے بھی ٹکر لے گا۔"

شہتی نے آنکھیں کھولیں۔ "بھگوان کاکا مجھے تور دلئی کے پاس لے چلو۔"

"بیٹی تمہارا جانا ٹھیک نہیں۔ میں خود ہی سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک تور دلئی کو تمہارے پاس نہ پہنچا دوں۔" والدین نے بہتیرا سمجھایا لیکن شہتی مچل گئی کہ میں ضرور جاؤں گی اور جب صبح ہوئی تو بھگوان داس، شہتی اور متجاب خاں تینوں نے رخت سفر باندھ لیا لیکن بھگوان نے متجاب کو ساتھ جانے سے روک دیا اور خود شہتی کو لے کر روانہ ہوگیا۔

اٹک کا خونخوار دریا پار کر کے دونوں شہنشاہ اکبر کے فولادی قلعہ میں پہنچے وہاں پہنچکر انہیں معلوم ہوا کہ کل تور دلئی کو زمین میں گاڑ کر اس پر خونخوار کتے چھوڑے جائیں گے۔

یہ سنتے ہی شہتی کا سر چکرانے لگا، قریب تھا کہ وہ غش کھا کر گر پڑے۔ لیکن بھگوان داس نے اسے سنبھالا دیا۔ "بیٹی تمہارے سینے میں پٹھان عورت کا دل ہے۔ تم متجاب خاں کی بیٹی اور منڈر قبیلے کی شہزادی ہو۔ تمہیں دلیری کے ساتھ ہر مصیبت کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ بدحواس ہونے سے ہم تور دلئی کی زندگی نہیں بچا سکیں گے۔ اس کے لئے کوئی تدبیر سوچنی پڑے گی۔"

بھگوان کے ذہن میں فوراً ایک تدبیر آئی۔ وہ شاہی کتوں کے نگہبان کے پاس پہنچا لیکن

اس نے صاف انکار کردیا ۔" اکبر اعظم کے حکم کو ٹالنا میرے بس کی بات نہیں ۔ ۔ بھگوان ہوش کی باتیں کرو۔" اس جواب سے بھگوان کو بڑی مایوسی ہوئی لیکن اس نے حوصلہ نہ ہارا ۔ وہ گھر جاکر اپنی بہو کے کنگن لایا اور کتوں کے نگہبان کے آگے ڈال دیئے۔

اگلے دن جب تور دلئی پر خونخوار کتے چھوڑے گئے تو وہ بڑی تیزی سے اس کی طرف لپکے لیکن قریب پہنچ کر اسے سونگھنے لگے اور سونگھ کر واپس چلے گئے۔

تماشائی حیران تھے ۔ ان کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا۔ یہ خبر سن کر اکبر کو بھی بڑا تعجب ہوا اور اس نے غصے میں آکر حکم دیا کہ شاہی فیل خانے کے مست ہاتھی سے مجرم کو کچلوا دیا جائے۔ اس نئے حکم نے بھگوان کا خون بھی خشک کر دیا لیکن اس نے اپنی کوشش جاری رکھی، وہ شاہی مہاوت کے پاس پہنچا لیکن وہ نہایت سرد مہری سے پیش آیا۔ بھگوان مغموم ہو کر گھر آیا اور الٹی کھٹوائی لے کر پڑ رہا۔ لیکن اس کی بہو بولی "بابا شہی کے لئے ہم سب کچھ کریں گے۔ مہاوت کی بیٹی میری منہ بولی بہن ہے ۔ میں ابھی جاکر اس سے کہتی ہوں کہ اپنے ابا سے کہہ کر تور دلئی کو بچا لے۔"

شہر میں ڈونڈی پٹ گئی ۔ لوگ جوق در جوق میدان میں جمع ہونے لگے ۔ "کتوں سے تو بچ گیا لیکن ہاتھی بڑا ظالم ہے، یہ نہیں چھوڑے گا بچارے کو۔"

اتنے میں ایک مست و خونخوار ہاتھی چنگھاڑتا، کف اڑاتا ایک طرف سے نمودار ہوا۔ لوگ سہم گئے۔ سب کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ فیل مست نے تور دلئی کے پاس آکر اپنا خوفناک پاؤں اٹھایا، لوگوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، ہاتھی نے پاؤں زمین پر مارا، زمین دہل گئی۔ لوگوں نے سمجھا کہ تور دلئی کا نام ونشان تک نہ رہا ہوگا ۔ لیکن وہ زندہ سلامت موجود تھا۔ لوگوں نے کہا یہ شخص ضرور کوئی جادوگر ہے۔ شہنشاہ نے سنا تو برہم ہو کر کہا اسے ہمارے حضور پیش کیا جائے۔ تور دلئی کا ترلور، منور شہنشاہ کے حفاظتی دستے میں شامل تھا۔

شہنشاہ نے تور دلئی پر غضب آلود نگاہ ڈالی اور منور سے مخاطب ہو کر کہا "کیا یہی وہ باغی ہے جس نے مابدولت کے مقابلے میں منڈروں کی مدد کی اور تمہارے گاؤں پر ڈاکے ڈالے؟"

منور نے کہا "جی حضور" — پھر شہنشاہ نے نور دلئی سے کہا۔ "اے بد بخت تو نے شہنشاہ ہند کی حرم سرا میں داخل ہونے کی کیسے جرأت کی۔ کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ جرأت کتنی مہنگی پڑے گی؟" شاہ کی گرجدار آواز گونج رہی تھی۔ دربار پر مہیب سناٹا طاری تھا۔

"رحم، رحم، رحم، ان داتا" — دور سے بھگوان شبھی اور لتا کی آوازیں آئیں جنہیں چوبدار نے اندر آنے سے روک دیا تھا۔ "فریادیوں کو حاضر کیا جائے" ان داتا نے حکم دیا۔

"ان داتا نور دلئی کی جان بخشی کی جائے ورنہ اس دوشیزہ کا سہاگ لٹ جائے گا۔" بھگوان نے ہاتھ جوڑ کے التجا کی۔ "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، اس نے ہمارے ناموس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی، اس نے حرم میں داخل ہونے کی گستاخی کی، اس کی سزا اسے ملنی چاہئے" شہنشاہ نے گویا اپنا آخری حکم سنایا۔

"بھائی منور — نور دلئی تمہارا چچازاد ہے۔ وہ تمہارا اور تم اس کے وارث ہو، شہنشاہ تمہاری بات مانتا ہے، اپنے بھائی کی جان بخشی کرا دو۔ میں تم سے بھیک مانگتی ہوں" شبھی نے منور کے سامنے اپنا دامن پھیلاتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحہ منور شاہ کی خدمت میں کورنش بجا لایا اور زمیں بوس ہو کر نور دلئی کی جان بخشی چاہی۔ "تعجب ہے کہ تم اپنے دشمن کی جان بچانا چاہتے ہو۔"

"ان داتا بجا فرماتے ہیں لیکن اس کی اور میری دشمنی قبائلی دشمنی ہے جو اپنے وطن تک محدود ہے، وہاں میری تلوار اس کا خون پینے کو بے قرار رہتی ہے لیکن یہاں یہ میرا مہمان ہے، اس لئے مجھے میرا قومی فرض مجبور کر رہا ہے کہ میں اس کی جان بچاؤں۔"

"لیکن ما بدولت کا حکم ناطق ہے۔ اس پر کوئی قلم بھی خط تنسیخ نہیں کھینچ سکتا۔ ہم تمہاری سفارش کو بے محل قرار دیتے ہوئے حکم دیتے ہیں کہ تمہیں ہی اپنے اس مہمان کا خون بہانا ہوگا۔"

"ان داتا — میرے خون میں ابھی غیرت و حمیت کے شرار موجود ہیں، پردیس میں میری تلوار اپنے بھائی کے خون سے رنگین نہیں ہو سکتی اور نہ میری موجودگی میں کوئی دوسرا اس کا خون بہا سکتا ہے — جہاں پناہ مجھے اپنی اس گستاخی کا انجام معلوم ہے لیکن میں مجبور ہوں

کیونکہ یہ میرے قومی وقار کا سوال ہے میں آخری مرتبہ درخواست کرتا ہوں کہ تور دلئی کو چھوڑ دیا جائے اور جس جرم میں اسے قتل کی سزا دی گئی ہے وہ ست لڑا ہار اس پٹھان دوشیزہ کو عنایت کیا جائے، اس کے عوض میرا سر حاضر ہے۔"

منور نے شاہی رعب و جلال کی آخری حدوں کو چھو لیا تھا۔

"تمہاری یہ جرأت قابل مذمت ہوتے ہوئے بھی مابدولت کو پسند آئی، اس لئے ہم حکم دیتے ہیں کہ تور دلئی کو رہا کر دیا جائے اور ملکہ کا ست لڑا ہار اس پٹھان دوشیزہ کو پہنا دیا جائے۔ اور اس کے بدلے منور کو اسی وقت بر سر عام تختۂ دار پہ کھینچ دیا جائے۔"

شہی اور تور دلئی نے منور کے پاؤں پکڑ لئے "منور بھائی یہ تو نے کیا کیا؟ ہم قبیلے کو کیا منہ دکھائیں گے؟"

منور نے دونوں کو گلے لگا لیا۔ "شہی بہن تیرا سہاگ تجھے مبارک ہو، شکر ہے اللہ نے مجھے تمہارے سامنے سرخرو کیا۔ تور دلئی بھائی مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم پر بڑے ظلم کئے۔ میرا خون اگر میرے گناہوں کا کفارہ ہو سکے تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ امید ہے اب تمہارے دل میں میری طرف سے کوئی کدورت نہ ہوگی۔"

بھگوان اور لتا نے اپنے مہمان کو آنسوؤں کے ہجوم میں الوداع کہی۔ کشتی اٹک کی تند و تیز موجوں پر بہے جا رہی تھی۔ خیرآباد پہنچ کر وہ کشتی سے اترے اور پیدل چل پڑے۔ محبت کے ان پروانوں کو اکوڑے کے قریب ایک جنگل میں رات بسر کرنی پڑی۔ نصف شب کے قریب شہی کو پیاس محسوس ہوئی۔ سنسان جنگل کی وحشتناک ویرانی، گھپ اندھیرا اور پانی کی تلاش ــــ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ تلاش کرتے کرتے ایک طرف پہاڑی کے دامن میں خانہ بدوش کوچیوں کے خیمے نظر آئے۔ تور دلئی نے اس طرف کا رخ کیا۔ خیموں کے قریب پہنچا تو کوچیوں کے خونخوار کتے بھیڑیوں کی طرح اس پر لپکے ــــ کتوں کا شور سن کر کوچی بیدار ہوئے اور سمجھے شاید ڈاکوؤں نے ہلّہ بول دیا ہے۔ وہ تلواریں سونت کر نکل پڑے اور اندھیرے میں بیسیوں تلواریں تور دلئی پر ٹوٹ پڑیں!

ادھر پیاس کی شدت سے شہی کا برا حال ہو رہا تھا، جب کافی دیر ہو گئی اور تور دلئی نہ لوٹا تو وہ مجبور ہو کر اس کی تلاش میں نکلی۔ سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ کوچیوں کے خیموں کو دیکھ کر وہ اس طرف بڑھی۔ اور جب خیموں کے نزدیک پہنچی تو تور دلئی کی لاش کو خون میں نہایا ہوا پایا۔ وہ تور دلئی کہہ کر اس کی لاش سے چمٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔

"تور دلئی ؟ — ڈاکو تور دلئی ؟" — کوچیوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ وہ دوڑے دوڑے آئے۔ شہی کو لاش سے جدا کیا لیکن آہ وہ بھی اپنے محبوب کے پاس جا چکی تھی!

خانہ بدوشوں کے اس چھوٹے سے ہنستے کھیلتے جزیرے پر یک لخت افسردگی چھا گئی۔ اچانک اور ناحق دو انسانوں کا خون بہہ جانے پر سارا قافلہ پریشان تھا، وہ ان لاشوں کو دفنانے کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ شہنشاہ اکبر کے سپاہیوں کی بھاری جمعیت ایک جنازہ اٹھائے ہوئے ادھر سے گزری اور جب انہیں پتہ چلا کہ تور دلئی قتل ہو چکا ہے اور شہی مر چکی ہے تو وہ ان کی لاشیں بھی اپنے ساتھ ہی لیتے گئے۔

منڈر اور یوسف زئی قبیلوں کو اس مشترک المیے نے ایک صف میں کھڑا کر دیا، دونوں کی ہری بھری فصل ایک ہی بجلی نے پھونکی تھی۔ دونوں کے دل ایک ہی سیخ میں پرو دیے گئے تھے، دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ محبت، غیرت اور حمیت کے ان تینوں شہیدوں کو اسی سرسبز و شاداب چراگاہ میں دفن کر دیا گیا جسے ہزاروں منڈروں اور یوسف زئیوں کے خون نے سینچا تھا +

زرسانگہ

فہمیدہ اختر

لنڈی خانہ کے درخت شہتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ گہرے سبز رنگ کے گول گول سے پتوں میں مونگیا رنگ کے شہتوں کے خوشے لنڈی خانے میں گہرا حسن پھیلا رہے تھے۔ زرسانگہ کے قدم رقص کی سی کیفیت لئے شاطرینہ سے آگے بڑھ گئے۔ اس نے ہنستی ہوئی نظروں سے شہتوں کے شاداب درختوں کو دیکھا اور دوپٹہ سامنے والے درخت کی اوپر والی شاخ پر پھینک کر اسے نیچے جھکا لیا۔ اور شہتوں کے خوشے توڑ توڑ کر جھولی میں ڈالنے لگی۔ جب جھولی بھر گئی تو دونوں ہاتھوں سے اسے رگڑ سی دی۔ خوشوں میں سے شہتوں کے دانے جھولی میں بکھر سے گئے۔ اس نے دانے ٹوکری میں ڈال دیئے اور دانوں سے خالی خوشے پھینک دیئے۔ اس نے دوسری شاخ جھکائی اور دونوں ہاتھوں میں اسے پکڑ کر جھولا سا جھولنے لگی۔ اتنے میں اس کے کانوں میں ایک رسیلی سی آواز آئی۔ "بہت خوش ہو نا، بھائی کی منگنی ہونے والی ہے۔ آخر کیوں نہ اتنی خوشی ہو آٹھ بہنوں کا ایک بھائی ہے۔" زرسانگہ نے ایک دم سے رک کر سامنے دیکھا۔ اس کی نظر درختوں میں چھپی ہوئی گل منداپر پڑی۔ ایک لطیف قہقہہ اس کے پاکیزہ لبوں پر پھیل گیا۔ جھکی ہوئی شاخ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ وہ بولی: "منگنی تو جمعہ کو ہوئی ہے مگر خوشی منانی ابھی باقی ہے، ہمارے آدمی جلال آباد گئے ہوئے ہیں، قوال لانے کے لئے۔" گل مندا مسکرائی اور زرسانگہ کے قریب آتے ہوئے بولی۔ "اچھا، مجھے تو علم نہ تھا، تمھیں مبارک ہو۔"

زرسانگہ کی نشیلی آنکھوں میں شیشوں کے درختوں کی ساری ٹھنڈک بھر گئی۔ اس نے دعا دی "خدا کرے تمھارے بھائی کی منگنی بھی جلد ہو جائے۔" گل مندا نے پوچھا "وہ لوگ کب لوٹیں گے جلال آباد سے؟" زرسانگہ نے آزاد سرزمین کی آزاد ہواؤں میں ایک سرد سانس لیتے ہوئے کہا "ہوسکتا ہے آج ہی آجائیں، پھر آج رات کو ہی محفل جمے گی، تم بھی آنا نا ہمارے ہاں، چھت پر سے تماشا دیکھیں گے۔" اور زرسانگہ کے خوبصورت ہاتھ اوپر اٹھ گئے اور اس کی لانبی لانبی سفید سفید انگلیاں گریبان میں اٹکے ہوئے کابلی روپوں پر ٹِک ٹِک کرنے لگیں۔ گویا وہ بھائی کی منگنی کی خوشی میں کوئی سریلا سا ساز بجانے لگ گئی ہو۔ ایک مضبوط ہاتھ نے پیچھے سے آکر اس کا بایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ گل مندا کی نظریں کانپ گئیں۔ اور زرسانگہ کا دایاں ہاتھ کابلی روپوں پر ساز بجاتا ہوا ایک دم رک گیا۔ اس نے حیران ہو کر بائیں جانب دیکھا۔ اس کی نظر شاہ خمیر پر پڑی۔ وہ فوراً معاملے کو سمجھ گئی اور اسے حقیقت بتانے کے انداز میں چلائی "میں 'بازار' کے یار محمد کے خاندان سے نہیں ہوں، میں 'کرمنہ' کے بادشاہ گل کے خاندان سے ہوں، میرا لباس تو دیکھو 'یہ' 'کرمنہ' کا لباس ہے۔" مگر شاہ خمیر نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے اپنے پیچھے کھینچنے لگا۔ گل مندا گرجی "یہ سچ کہہ رہی ہے، اسے چھوڑ دو" شاطرینہ نے دور درختوں کے درمیان سے دیکھا اور اس کے چہرے کے اردگرد دہکتے ہوئے انگاروں نے حلقہ کر لیا۔ اس نے ایک بھاری پتھر اٹھایا تاکہ شاہ خمیر کا سر پھوڑ دے۔ اچانک اس کی نظر شاہ خمیر کے دو ساتھیوں پر پڑ گئی۔ اسے اپنی جان بھی خطرے میں محسوس ہوئی۔ وہ غصے میں لرزتی ہوئی درختوں کی آڑ میں ہو گئی۔ زرسانگہ کے کانوں میں قبائلی علاقے کی تیز و تند آندھیوں کا سارا شور بس چکا تھا۔ وہ طوفانوں کی طرح چیخی "میں زخاخیلوں کے بہادر اور غیرت مند قبیلے سے ہوں، بدبخت ہمارے ساتھ کیوں دشمنی مول لیتے ہو؟" جب اس نے محسوس کیا کہ شاہ خمیر اکیلا نہیں، اس کے ہمراہ دو نوجوان اور بھی ہیں تو اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا "اے بہادرو! پہلے دشمن کو پہچانا کرو، پھر دشمنی کیا کرو۔" شاہ خمیر کے قدم مدھم پڑ گئے، اس نے مڑ کر زرسانگہ کی طرف دیکھا۔ شکر خان غرایا۔ "ایسے ہی کہہ رہی ہے، مت چھوڑنا۔" اس کے ساتھ ہی شاہ خمیر کی رفتار تیز ہو گئی۔

جوان اوّل بی بی کیمپ کے باہر بیٹھی اپنا سرخ رنگ کا کُرتہ سی رہی تھی۔ جب اس کی نظر شاہ خمیر اور زرسانگہ پر پڑی تو اس کی سفید پیشانی پر کئی شکنیں نمودار ہو گئیں۔ اور ان شکنوں میں سوچ کے آثار نمایاں ہو گئے۔ چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی، کُرتہ کندھے پر ڈالا اور زرسانگہ کے قریب آ کر اسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ زرسانگہ کے ترو تازہ چہرے پر شفق کی ساری سرخیاں جمع تھیں، اس کا سانس تیزی سے آ جا رہا تھا اور اس کی نشیلی آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔ اوّل بی بی نے قہر آلود نظر شوہر پر ڈالی اور بولی "نئی دشمنی مول لے لی؟ یہ لڑکی یار محمد کے خاندان سے نہیں، یہ کرمنہ کی معلوم ہوتی ہے۔" شاہ خمیر کی نظروں میں غصّہ بھر گیا۔ وہ شکر خان کی طرف دیکھنے لگا۔ زرسانگہ نے بھی ایک لمحے کے لئے شکر خان کی طرف دیکھا۔ شکر خان کو یوں لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو "تم ایک ٹھیک دشمن نہیں ہو۔" شکر خان کے سینے میں پشیمانیوں کے مدّو جزر اٹھنے لگے۔ وہ شانے کے ساتھ لٹکے ہوئے پستول سے کھیلنے لگا اور خفت آمیز لہجے میں بولا "تو کیا ہوا، یہ واپس جا سکتی ہے۔"

اوّل بی بی نے زرسانگہ کے شانے پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "چلو بہن کچھ کھا پی لو، تھک بھی گئی ہو گی، ذرا آرام کر لو، دوپہر کے بعد چلی جانا۔"

زرسانگہ نے بے قراری سے کہا "نہیں میں اسی وقت واپس جاؤں گی۔"

اوّل بی بی اسے سمجھانے لگی "اتنا صبر کرو بہن کہ گل اکبر اور خان بادشاہ آ جائیں، ان کو تمہارے ساتھ بھیج دوں گی، تم اکیلی کیسے جاؤ گی؟"

زرسانگہ کیمپ کے اندر جا کر چارپائی پر ایک طرف چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اوّل بی بی نے اس کے سامنے ایک چنگیر لا کر رکھ دی۔ اس میں لسّی سے بھرا ہوا کٹورہ، مکھن، پیاز اور جوار کی دو روٹیاں تھیں۔

زرسانگہ منہ پھیر کر بولی "میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

اوّل بی بی نے نرمی سے کہا "تم ہماری مہمان ہو بہن، تمہارے خاندان سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔" اور لسّی کا پیالہ زرسانگہ کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

جب قبائلی علاقے کی ہواؤں میں دوپہر کی تمازت بھر گئی تو زرسانگہ، گل اکبر اور خان بادشاہ کے ساتھ چل پڑی۔ 'لچ لرگی' کا پہاڑ عبور کر کے وہ اسے "لنڈی خانے" تک چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ شینوں کے ٹھنڈے سایوں والے درختوں کے جھنڈ تک پہنچ کر اسے اپنی نند شاطرینہ کا خیال آیا۔ اس نے 'کرمنے' کے سارے علاقے میں آگ لگا دی ہو گی! ایسا نہ ہو کہ آدم خیل آ چکا ہو، اور قوالوں کو واپس کر دیا ہو۔ وہ شینوں کے خوبصورت درختوں میں بھاگنے لگی۔ آن کی آن میں تاغیانو کے پہاڑ پر چڑھ گئی، اور پھر تیزی سے دوسری طرف اتر گئی۔ جب اس نے 'کرمنے' کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس کا جی چاہا کسی سے پوچھے "میرے بھائی نے قوال تو واپس نہیں کر دیئے؟" اچانک اس کی نظر بارآنے پر پڑی جو کھیتوں کے درمیان والی پگڈنڈیوں پر سے گزر رہا تھا۔ وہ اس کے قریب جا کر بے تابی سے بولی "میرا بھائی جلال آباد سے آ گیا ہے؟ اس نے قوال تو واپس نہیں کر دیئے؟" بارآنے نے اسے حیران نظروں سے دیکھا اور کہا" وہ ابھی نہیں آیا۔" زرسانگہ کی زندگی کے گویا تمام اندیشے علاقہ آزاد کی فضاؤں میں کھو کر رہ گئے۔ وہ گنگنائی "خدایا ہم آٹھ بہنوں کے بھائی کو سات بیٹوں کا باپ کرنا!" بارآنے نے کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ پگڈنڈیوں پر سے دوڑتی چلی گئی۔

شاطرینہ صحن میں مرجھائی ہوئی بیٹھی تھی۔ محلہ کی چند عورتیں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔ جب ان کی نگاہ زرسانگہ پر پڑی تو وہ چونک سی گئیں اور اس طرح اسے دیکھنے لگیں جیسے ماضی کے پردوں میں چھپے ہوئے کسی شناسا کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ چند لمحے لگاتار دیکھنے کے بعد شاطرینہ کا سوبا ہوا چہرہ جاگ اٹھا۔ وہ بھاگ کر آئی اور اپنی حسین بھاوج کے گلے سے لپٹ گئی۔

کرمنہ میں شور مچ گیا کہ زرسانگہ واپس آ گئی، وہ غلطی سے لے جائی گئی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا گھر عورتوں اور بچوں سے بھر گیا۔ سب اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے تھے جیسے انھوں نے اسے پہلی بار دیکھا ہو اور وہ کسی اجنبی شہر سے آئی ہو۔

جب دن کے اجالے شام کے دھندلکوں میں ڈولنے لگے تو ننھا رخسے بھاگتا ہوا آیا اور بولا "وہ آ گئے ہیں۔" زرسانگہ کا جی چاہا کہ وہ رخسے کو گود میں اٹھا کر اس کا پھول سا چہرہ چوم لے، مگر وہ جلدی سے باہر بھاگ گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی چھت پر گئی اور دیوار کی آڑ میں ہو کر نیچے دیکھنے

لگی۔ اس کی نظر کئی چہروں پر پڑنے کے بعد آدم خیل پر پڑی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ناچتی ناچتی اس تک پہنچ جائے اور اسے سینے سے لگائے اور کہے "میرے اچھے بھائی، اللہ تجھے سات بیٹوں کا باپ بنائے۔"

یارمست کرمنہ کی چہ میگوئیوں سے بے خبر حجرے کو درست کرنے لگ گیا۔ اس کے چہرے پر جلال آباد کے سفر کی تکان کے کوئی آثار نہ تھے۔ حجرے کے چاروں طرف چارپائیاں ڈال دی گئیں۔ اور درمیان میں چٹائی بچھادی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کرمنہ کے جوان اور بوڑھے بندوقیں تھامے ان کی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ بچے قوالوں کے اردگرد زمین پر جمع ہو گئے۔ محلہ کی کئی عورتیں آئیں اور زرسانگہ کے پاس چھت پر چلی گئیں۔ قوالوں نے قوالی شروع کردی اور کرمنہ کے در و دیوار موسیقی کی تانوں میں کھو گئے۔

یارمست محسوس کرنے لگا کہ محفل میں بیٹھے ہوئے لوگ جب اس کی طرف دیکھتے ہیں تو ان کی نظریں کوئی عجیب سی کہانی سنانے لگتی ہیں۔ اس نے غنزل سے پوچھا۔ "یہ کیا بات ہے؟" غنزل نے اسے اشارہ کیا اور وہ دونوں موسیقی کی محفل سے باہر نکل گئے۔

غنزل صبح کا واقعہ سناتا گیا اور یارمست کا خون کھولتا گیا۔ جب غنزل خاموش ہوگیا تو یارمست نے ایک جھٹکے کے ساتھ ہاتھ میں تھامی ہوئی بندوق کو کندھے کے ساتھ لگالیا۔ اور بھاری بھاری قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ غنزل اس کے پیچھے بھاگا "دیکھو دوست، بھابی بے قصور ہے، اسے کچھ نہ کہنا۔"

یارمست غرایا "اسے بازار کے علاقے میں جاکر شیشے اکٹھے کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ لوگ میری طرف دیکھیں اور کہیں کہ اس کی بیوی کو فلاں لوگ پکڑ کر لے گئے تھے؟ تم چاہتے ہو کہ میں بے غیرت بن جاؤں اور خاموش رہوں؟" اور وہ تیز تیز قدموں سے جانے لگا۔ غنزل دیر تک وہاں حیران اور پریشان کھڑا رہا۔

صحن میں قدم رکھتے ہی یارمست نے بیوی کو پکارا۔ آواز میں پہاڑوں کی سی سختی اور طوفان کا سا جوش تھا۔ بھائی کی منگنی کی خوشیوں میں مگن اور ساری کائنات سے بے خبر زرسانگہ سر سے

پاؤں تک کانپ گئی اور لرزتے قدموں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آنے لگی۔ باقی عورتیں خوفزدہ ہو کر چھت کے اس کنارے پر آگئیں۔ یار مست گرجا "میرے گھر سے اسی وقت نکل جاؤ، میں بے غیرت نہیں ہوں کہ اس عورت کو گھر میں رکھوں جس کے ہاتھوں میری بے عزتی ہو" زر سانگہ کے حلق میں آزاد علاقہ کے سارے کانٹے چبھ گئے۔ چھت پر بیٹھی ہوئی عورتیں لرز کر رہ گئیں۔ شاطر بینہ کو چکر سا آگیا، وہ بھاگ کر آئی اور بھائی کے قدموں میں گر پڑی۔ "میرے بھائی، اس بچاری کا کیا قصور ہے؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟" یار مست نے پاؤں کھینچ لئے۔ "میں نہیں چاہتا کہ میرے وطن کے دشمن اسے میرے لئے ایک مستقل طعنہ بنا دیں۔ میں وطن کے لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں غیرت مند ہوں۔" پھر وہ بندوق زمین پر زور سے مار کر بولا "تم ابھی تک کھڑی ہو، میں کہتا ہوں جاؤ، بھائی کے گھر کا رُخ کرو۔"

زر سانگہ بوجھل قدموں سے دروازے سے نکل گئی۔ اس کی زندگی کی راہوں پر جلتے ہوئے سارے دیئے بجھ گئے۔ چاروں طرف تاریکیاں پھیل گئیں۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے اس نے دیوار کا سہارا لے لیا۔ کیا یہ خواب ہے؟ اس نے بے جان سے دل کے ساتھ سوچا۔ وہ زور زور سے آنکھیں جھپکانے لگی۔ تو کیا یہ حقیقت ہے؟ اس کے سوئے ہوئے سے دماغ میں یہ خیال ابھرا۔ اس کے ساتھ ہی موسیقی کی تانیں بستی کے لوگوں کے تمسخر آمیز قہقہوں میں بدل گئیں۔ وہ آگ اگلتے ہوئے تنور میں جا گری، اس کے لبوں کو تیزی سے جنبش ہوئی۔ "یہ شاطر بینہ کا بھائی سمجھتا ہے کہ وہ غیرت مند ہے اور میں غیرت مندوں کی بیٹی نہیں ہوں" اس کے پاؤں تیزی سے حرکت میں آگئے، وہ بھائی کے حجرے کی طرف بھاگتی ہوئی چلی گئی۔

آدم خیل سامنے والی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ روز کی نسبت زیادہ خوبصورت اور جوان معلوم ہو رہا تھا۔ اچانک زر سانگہ کو یوں لگا جیسے وہ دور دیس کے ایک طاقتور قبیلے کو اس کا دشمن بننے کے لئے پکارنے آئی ہے۔ وہ پسینہ پسینہ ہو گئی۔ اس کی نظریں اوپر اٹھ گئیں آسمان کی نیلاہٹوں میں سات تاروں کا جھرمٹ بڑی تیزی سے چمک رہا تھا۔ اس نے اس کی چھاؤں میں گہری ٹھنڈک محسوس کی۔ اس کے قدموں نے اس طرف لپکنا چاہا، مگر اسی لمحے اس نے

پریشان ہوکر چاروں طرف دیکھا۔ کائنات پکارنے لگی تھی "بے غیرت!" شعلے لپکے اور اس کی روح سے بغلگیر ہو گئے۔ ان کی گرمی میں نیلگوں آسمان پر چمکنے والے سات تارے اپنی ساری ٹھنڈک کھو بیٹھے۔ وہ اس زور سے کھانس دی کہ محفل میں سے بہتوں کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وو‌وان شاہ جلدی سے اس کے پاس آیا اور پوچھا "کیا بات ہے؟" وہ بے چینی سے بولی: "آدم خیل کو بھیج دو۔"

آدم خیل نے قریب آتے ہی خوشی کے لہجے میں کہنا چاہا: قوال اچھے ہیں؟ میں تو نہیں لانا چاہتا تھا، پھر سوچا چلو ہماری بہن خوش ہو جائے گی، اصرار کر رہی ہے"۔ مگر جب اس نے تاروں کی مدھم روشنی میں اسے غور سے دیکھا تو پریشان ہو کر کہا "کیا بات ہے؟ کسی نے تمھیں کچھ کہا ہے؟"

زرسانگہ اسے صبح کی واردات سنانے لگی، اس کی آواز میں تند ہواؤں کا سا زور تھا جب وہ خاموش ہو گئی تو آدم خیل اداسی سے بولا "تو یارمست نے تمھیں گھر سے نکال دیا ہے؟"

"ہاں، وہ کہتا ہے میں بے غیرت نہیں ہوں کہ تمھیں گھر میں رکھوں۔ تمھارے ہاتھوں میری بے عزتی ہوئی ہے۔" پھر اس کا وجود تیزی سے جلنے لگا۔ وہ چیخ پڑی، "اس نے اس طرح مجھے گھر سے نکال کر تمھاری غیرت کو پکارا ہے۔"

آدم خیل کے صحت مند وجود میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا "میری غیرت اس پکار کو سنے گی، میرے پیچھے آؤ۔"

یارمست صحن میں بیٹھا بندوق گود میں لئے کلائیاں گھٹنوں پر رکھے اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھامے کچھ سوچ رہا تھا۔ جب ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھلا تو وہ چونک اٹھا، لالٹین کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ آدم خیل کی آنکھوں میں کسی پختہ مگر خطرناک عزم کی سرخی ہے اور اس کے پیچھے زرسانگہ کھڑی ہے۔ آدم خیل گرجا "میں دشمنوں کو غیرت کے معنی سمجھانے جا رہا ہوں۔ اب تمھیں میری بہن کو گھر سے نکالنے کی ضرورت نہیں۔" اور جب وہ دروازے کی طرف مڑا تو زرسانگہ بولی "شاہ خمیر تو مجھے راستے سے ہی واپس کر دیتا لیکن شکر خان نے اسے ایسا کرنے سے

روکا۔"

آدم خیل سوچ میں پڑ گیا۔ "میں نے شکر خان کو کبھی نہیں دیکھا۔"

زرسانگہ جلدی سے بولی "اس کے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں۔"

یہ سنتے ہی آدم خیل تیزی سے دروازے سے نکل گیا۔ اس وقت اس کے قدموں کی چاپ سے زمین کا سینہ کانپ رہا تھا۔ حجرے میں پہنچتے ہی وہ چیخا "بند کر دو یہ موسیقی۔"

موسیقی ایک دم بند ہو گئی۔ آدم خیل کے سرخ چہرے کی طرف لوگ اس طرح دیکھنے لگے جیسے انھیں تمام معاملے کا علم ہو۔ مست غلی اسے مشورہ دینے لگا "اس وقت اس محفل کو درہم برہم نہ کرو۔"

آدم خیل بندوق پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "جب تک میں دشمنوں سے انتقام نہیں لے لیتا صرف اس بندوق سے پیار کروں گا۔"

مست غلی کہنے لگا "انتقام کا وقت معین نہیں ہوتا۔ انتقام چالیس سالوں میں بھی لیا جا سکتا ہے۔"

"میں باعزت بادشاہ گل کا بیٹا ہوں، میری نظروں میں بے عزتی کے انتقام کا وقت معین ہے، میں چالیس گھنٹوں کے اندر اندر انتقام لوں گا۔"

مست غلی کے چہرے پر فکر کے آثار پیدا ہو گئے۔ "بے وقوف نہ بنو آدم خیل، بہتر موقع کی تلاش میں رہو۔ شاہ خمیر کیمپ میں رہتا ہے اور کیمپ میں گورا فوج ہے۔"

آدم خیل گرجا "تم بھولتے ہو مست غلی، غیرت کی آگ پہاڑوں میں شگاف پیدا کر دیتی ہے اور سمندر کے پانیوں کو خشک کر ڈالتی ہے۔"

پوری محفل نے یہ سب کچھ سنا۔ روغن شاہ نے بنات گل سے کہا "غیرت مندوں کی اولاد غیرت مند ہوتی ہے، طاقتوروں کے مقابلہ پر جا رہا ہے، وہ چھ بھائی ہیں اور یہ تنہا ہے۔"

ملنگ نے خان میر سے کہا "عزت دنیا کی بہت بڑی دولت ہے۔"

اسی رات علاقہ غیر کے آسمان پر چمکنے والے چاند نے ایک خوبصورت نوجوان کو دیکھا

جس نے بندوق تھامے تیز تیز قدموں سے بوڑھے پہاڑ کو عبور کیا اور خیبر سے ہو کر لواڑگی کی طرف چلا۔ اس کے پیچھے لالٹین تھامے اس کے دو ساتھی تھے۔

صبح چار سیر گوشت خریدا گیا اور سیڑھی کہیں سے حاصل کی گئی اور رات کی تاریکی میں جب کیمپ کا رخ کیا گیا تو کتے بھونکنے لگے۔ ان کے آگے چار سیر گوشت پھینک دیا گیا، وہ گوشت کھانے لگے۔ رات خاموش ہو گئی۔ کیمپ کی دیوار کے ساتھ سیڑھی کھڑی کر دی گئی۔ آدم خیل بڑے اطمینان سے اوپر چڑھا، دیوار کے اندر کی جانب دایاں پاؤں اور باہر کی جانب بایاں پاؤں لٹکا کر سیڑھی اوپر کھینچنے لگا۔ نیچے سے گل نواز اور مستے خان سیڑھی اوپر کی طرف اٹھا رہے تھے۔ جب وہ اوپر اٹھ گئی تو آدم خیل اسے کیمپ کے اندر کی جانب جھکانے لگا۔ یہاں تک کہ وہ دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ آدم خیل نیچے اترا۔ اسے چاند کی مدھم روشنی میں کئی چارپائیاں نظر آئیں، وہ ایک چارپائی کے پاس گیا، وہاں ایک عورت کو سویا ہوا پایا، دوسری چارپائی کے پاس گیا تو نظر چیچک کے داغوں سے آلودہ چہرے پر پڑی۔ اس کے سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس نے حقارت سے چیچک زدہ چہرے کو دیکھا اور بندوق اس کے سینے پر رکھ کر چلا دی۔ کیمپ میں سوئے ہوئے لوگ ایک دم جاگ پڑے، انھیں یوں محسوس ہوا جیسے خواب میں کچھ دیکھا ہو۔ کیمپ کے اندر کسی کا قتل! کوئی اتنی جرأت کر سکتا ہے؟ ہر ایک کا ذہن یہی سوچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کسی وہم کے پیدا ہوتے ہی شاہ خمیر نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سید اکبر نے بھی عین اسی وقت سر اٹھایا، اور پوچھا "گولی چلنے کی آواز تھی؟" اب تو شاہ خمیر گھبرایا اور جلدی سے بولا "ہاں" پھر وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اور سرہانے رکھی ہوئی بندوق فوراً ہاتھ میں تھام لی۔ سید اکبر بھی اٹھ بیٹھا اور پورے کیمپ میں کھلبلی مچ گئی۔ اس وقت تک آدم خیل دیوار پھاند کر کیمپ سے دور جا چکا تھا۔ ایک دم کیمپ سے روشنیاں بلند ہوئیں، آدم خیل اور اس کے ساتھی سیڑھی کے ساتھ زمین پر منھ کے بل لیٹ گئے۔ جب اندھیرا چھا گیا تو بجلی کی سی تیزی سے اٹھے اور بھاگنے لگے۔ پھر روشنیاں بلند ہوئیں اور وہ پھر زمین کے سینے سے چمٹ گئے۔ جانے کتنی بار روشنیاں بلند ہوئیں اور کتنی بار ان کے تندرست وجودوں نے زمین کی چھاتی کو چھوا۔

دوسرے روز صبح تک 'کرمنہ' یہ خبر پہنچ گئی کہ آدم خیل کامیاب رہا۔ اسی روز مغرب کے وقت وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چپکے سے توآڑگی کے ایک مکان سے نکلا اور کرمنہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ بوڑتے پہاڑ کو عبور کرنے تک وہ بڑے چوکنے رہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ چاروں طرف نظریں دوڑا لیتے۔ بوڑتے پہاڑ کو عبور کرنے کے بعد آدم خیل کے فتحمندانہ قدم بہن کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ بستی کے مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک جم غفیر اسے تحسین کی نظروں سے دیکھتا ہوا ساتھ ہولیا۔ زرسانگہ دوڑ کر آئی۔ اور اس کی مضبوط چھاتی سے چمٹ گئی۔ وہ غیور لہجے میں بولا "میں نے تمھیں وطن میں بہت اونچا کر دیا ہے۔" ان گنت نظریں زرسانگہ کی طرف اٹھ گئیں۔ زرسانگہ کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اس بستی کی ایک ایسی باوقار ملکہ ہے جس کی مسرتوں کے چمکتے ہوئے چاند کو بجھانے کے لئے دور دیس کا ایک قبیلہ کمر باندھ رہا ہے۔ ایکا ایکی سات دیئے نیلگوں آسمان میں بکھر کر خلاؤں میں کھو گئے۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔ اس نے آدم خیل کی چوڑی چھاتی کے گرد اپنی باہوں کا حلقہ اور تنگ کر لیا۔ اور اس کی جانب اٹھی ہوئی ان گنت نظروں میں عزت و توقیر کے ساتھ ساتھ رشک بھر گیا۔

★

بہرام وگل اندام

فیاض
مترجمہ: رضا ہمدانی

فیاض سترھویں صدی عیسوی کا ایک خانہ بدوش موسیقار تھا جو قصے نظم کر کے قریہ بہ قریہ، رباب کے تاروں کی زبانی اہلِ دل تک پہنچاتا تھا۔ "بہرام وگل اندام" اس کی ایک طویل رومانوی بلکہ پرانے زمانے کی اکثر کہانیوں کی طرح طلسمی داستان ہے جس کی دنیا میں شہزادوں، شہزادیوں اور جنوں، پریوں ہی کی دنیا ہے جس میں درویشوں ہی کی دعائیں اور دستگیری کام آتی ہے اور شکار ہی کا شاہانہ مشغلہ ہے جو شہزادوں کو رومان کی راہوں پر ڈال دیتا ہے۔ اور وہ کانٹوں کے فرش سے گذر کر پھولوں کی سیج پر پہنچ جاتے ہیں جہاں کوئی شہزادی ان کا انتظار کرتی ہے۔ مترجم نے یہ ساری الف لیلہ چند الفاظ میں سمو دی ہے۔ آپ بھی اس کے ساتھ اس عالمِ خیال کی سیر کیجیے:۔

تھا دیارِ روم میں اک حکمراں — مملکت اس شاہ کی تھی بیکراں
دولت و جاہ و حشم میں کم نہ تھا — حسرت و آلام سے محرم نہ تھا!
طفلِ خوش اندام سے محروم تھا — جم تھا لیکن جام سے محروم تھا
منتیں مانیں، دعائیں کیں مگر — ہو سکا کوئی نہ حربہ کارگر
آخر اک درویش کے فیضان سے — ہو گیا آزاد اس خلجان سے
عالمِ پیری میں بر آئی امید — شامِ غم میں صبح کی پائی نوید

ڈوبتے دل کو سہارا مل گیا
چشمِ اشک افشاں کو تارا مل گیا

اسقدر تھا خوبرو وہ مہ لقا — جس نے دیکھا ہو گیا دل سے فدا

دوست انجم، وہ مہِ گلفام تھا — نام اس کا اصل میں بہرام تھا
تربیت اسکی ہوئی اس شان سے — رہ گئے اہلِ فلک حیران سے
جب وہ شہزادہ جواں ہونے لگا — ماہِ کنعاں کا گماں ہونے لگا
آنکھیں اس کی اسقدر مخمور تھیں — روم کی سب لڑکیاں مسحور تھیں
وہ کسی پر بھی نظر کرتا نہ تھا — وادیٔ غم میں قدم دھرتا نہ تھا
بے نیازی میں بہت مشہور تھا — وادیٔ الفت سے کوسوں دور تھا

صنفِ نازک ہی سے تھی نفرت اسے
تھی شکار و سیر سے رغبت اسے

ایک دن صحرا میں تھا محوِ شکار — ساتھ اسکے تھے ملازم بے شمار
ایک آہو کے تعاقب میں چلا — ہو گیا ہمراہیوں سے پر جُدا
سوچتا تھا یہ کہ اب جائے کدھر — سامنے اک جھونپڑا آیا نظر
دفعتاً دیکھا وہاں اک مردِ پیر — خال و خد میں خضر کی گویا نظیر
پیار سے اس نے بٹھایا اور کہا — کیسے آئے اور کیا ہے مدعا؟
سوچ کر کچھ مردِ حق کے سامنے — کہہ سنایا حال سب بہرام نے

سُن کے آہِ سرد وہ بھرنے لگا
داستاں اپنی بیاں کرنے لگا

بولا، دنیا گھوم کر آیا ہوں میں — کہکشاں کو چوم کر آیا ہوں میں
دیکھے ہیں لاکھوں حسینانِ جہاں — رشک جن پر کر رہا ہے آسماں
گرچہ ہیں وہ پیکرِ حسن و شباب — لعبتِ چیں کا نہیں کوئی جواب
شاہِ چیں کی دخترِ زیبا ہے وہ — تو کہے پیمانۂ صہبا ہے وہ

تندی کا اک چھلکتا جام ہے
نام اُس مہ وش کا گل اندام ہے

یہ بیاں سنتے ہی مردِ پیر کا — ہو گیا شہزادہ کچھ دلگیر سا
وہ تصور دل کو تڑپانے لگا — اُٹھ کے سمتِ چین وہ جانے لگا
ہجر کے اندوہ سے دل ریش تھا — رات دن اس کو سفر درپیش تھا
جاتے جاتے پیاس نے گھیرا اسے — ہر طرف سے یاس نے گھیرا اسے
راہ میں اک باغ دیکھا پُر بہار — گلشنِ جنت بھی ہے جس پر نثار
کچھ عجب پُر کیف تھا وہ گلستاں — جا بجا شفاف چشمے، ندیاں
تلخیٔ انجام سے غافل ہوا — دوڑ کر وہ باغ میں داخل ہوا
جھک کے اک چشمے سے جب پانی پیا — اک پری پیکر کا اس میں عکس تھا

یہ پری پیکر وہی گلفام تھی!
لعبتِ چین یعنی گل اندام تھی

جب نظر اس نے اٹھائی ایک بار — بس نگاہیں ہو گئیں اس سے دوچار
عشق آخر کام اپنا کر گیا — دل میں دونوں کے محبت بھر گیا
گفتگو کرکے لبِ خاموش سے — ہو گئے دونوں مگر بیہوش سے
دیر تک بجتا رہا الفت کا ساز — آنکھوں آنکھوں میں ہوئے راز و نیاز
جب وہ آپس میں جدا ہونے لگے — دونوں اپنے حال پر رونے لگے
اس طرف تھا غم سے شہزادہ نڈھال — اس طرف ابتر تھا شہزادی کا حال
تھے غمِ فرقت سے دونوں بیقرار — مشکلیں تھیں راستے میں بے شمار
جل رہے تھے آتشِ الفت سے وہ — مل نہ سکتے تھے کسی صورت سے وہ
رفتہ رفتہ مشکلیں حل ہو گئیں — دشمنوں کی قوتیں شل ہو گئیں

ختم جورِ آسماں ہو کر رہا
عشق آخر کامراں ہو کر رہا

پنج ند:

ہیر رانجھا

مرزا صاحبان

سوہنی مہینوال

میندھرا مومل

سسّی

ہیر رانجھا

حمید احمد خاں

دریائے چناب اپنی چھ سو میل کی روانی میں جن گلزاروں اور بیابانوں کے دامن پر لہراتا ہے ان کی فضائیں صدیوں سے شعر و سرور میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اس دریا کی دل کش وادیاں ایک الگ نفسیاتی آب و ہوا رکھتی ہیں۔ عشق و محبت کی کسک، تلاشِ حق کی لگن، چناب کی لہروں کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی ہے۔ گجرات، جھنگ، ملتان۔ ان میں سے کون سا نام ہے جو ہمیں حقیقی یا مجازی عشق کا کوئی دل نشیں رومان نہیں سناتا!

وادیٔ چناب کی یہ روحانی اور رومانی کیفیت مدتِ مدید سے عارفانہ اور عشقیہ شاعری کا موضوع بنتی رہی ہے۔ کیفیت کے جس خاص پہلو سے ہمیں اس وقت سروکار ہے اس کی سب سے مشہور یادگار جھنگ کے قدیم شہر میں ملتی ہے۔

اس شہر سے دو کوس باہر اینٹ کا بنا ہوا ایک مقبرہ ہے۔ سولھویں صدی کے مغلیہ مقبروں کے انداز میں بنا ہے۔ چاروں طرف دیواروں میں دریچے ہیں۔ مگر ایک دریچہ بند ہے اور ہمیشہ بند رہتا ہے۔ مقبرے کے اندر کھڑے ہو کر اوپر نظر اُٹھائیے تو آسمان دکھائی دیتا ہے۔ یہاں سے چناب کبھی اس قدر قریب تھا کہ اس کے کنارے گویا اس مقبرے کے پاؤں سے پلٹتے تھے۔ یہ وہ پُرانا چناب تھا جس سے انگریزی عہد کی نہروں کا پانی ابھی نہیں کاٹا گیا تھا اور جس کی نہروں نے قلزم کی طرح بپھرنا ابھی فراموش نہیں کیا تھا۔ لیکن اب وقت کے بہاؤ کے ساتھ دریا کا بہاؤ بھی

اپنا رُخ بدل چکا ہے۔ اب اس حسرت بھرے مزار تک پہنچنے کے لئے چناب کی ہوا دور سے آتی ہے اور اُس وقت کو یاد کرتی ہے جب چار سو برس بلکہ اس سے بھی پہلے اس وادی کی سب سے حسین اور جواں ہمت لڑکی ہیر نے اپنے وطن کی طرف کوچ کر کے اس دریا کو آخری مرتبہ عبور کیا۔ صرف اس لئے کہ اس مقبرے کی خاک اُس کے جسد عنصری کو ہمیشہ کے لئے اپنے دامن میں چھپا لے۔

عشق و محبوبی کی یہ داستان جھنگ میں نہیں بلکہ ضلع سرگودھا میں شروع ہوتی ہے۔ سولھویں صدی کے اوائل کا ذکر ہے کہ یہاں کے ایک قصبے، تخت ہزارہ میں ایک خوش حال اور معزز زمیندار رہتا تھا جس کا نام موجو چودھری تھا۔ یہ ذات کا رانجھا جاٹ تھا۔ اسکے آٹھ بیٹے تھے جن میں سب سے چھوٹا دھیدو کہلاتا تھا۔ یہی دھیدو بعد میں اپنی ذات کے نام سے مشہور ہوا اور رانجھا کہلایا۔ رانجھا کچھ تو چھوٹا بیٹا ہونے کے باعث اور کچھ اپنی خوبروئی کی وجہ سے باپ کا لاڈلا تھا۔ باپ کے لاڈ پیار سے وہ قدرتاً کچھ نازک مزاج، کچھ آرام پسند ہو گیا تھا۔ اُسے کھیتوں میں کام کرنے سے اتنی رغبت نہ تھی جتنی بانسری بجانے سے۔ بانسری بجانے میں اُسے کمال حاصل تھا۔ اِس شغل میں اس کی فطرت کے شاعرانہ جذبے کو تسکین ملتی تھی لیکن اس تسکین سے قطع نظر بانسری بجا کر زندگی بسر نہیں ہوتی۔ جب باپ کا انتقال ہوا تو رانجھا کھیتی باڑی کی زندگی کے درشت حقائق کی تاب نہ لا سکا۔ اُس کے نازک ہاتھوں میں ہل چلانے سے چھالے پڑ پڑ جاتے لیکن بھائیوں اور بھاوجوں سے اس معاملہ میں ہمدردی کی کوئی توقع نہ تھی، وہ سب اس معاملہ کو یوں دیکھتے تھے کہ آخر اس چھیل چھبیلے بانسری بجانے والے کی زندگی کا کوئی مصرف بھی ہے یا نہیں۔ اب کئی بار اُسے بھائیوں کی گھرکیاں اور بھاوجوں کے طعنے برداشت کرنے پڑتے۔ لیکن ایک دن صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ اور وہ گھڑی آ گئی۔ جب اُس نے اپنے اہلِ خاندان کو الوداع کہنے کی ٹھان لی۔ تخت ہزارہ سے وہ اس شان کے ساتھ نکلا کہ کندھے پر ایک کمبل تھا اور ہاتھ میں بانسری۔ رانجھا اب ایک بانکا بحیلا گبرو تھا۔ اسکے گھی سے چپڑے چمکتے ہوئے لمبے بال اس کے شانوں پر گرتے تھے۔ گاؤں سے نکل کر اس نے

جنوب کا رُخ کیا۔ آخر وہ چناب کے کنارے ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں دریا کے پار جھنگ کی بستیاں اور ان کے بیرونی کھیت سامنے نظر آتے تھے۔ یہ شہر سیال راجپوتوں کا گڑھ تھا۔ یہ لوگ نام ونسب پر نازاں تھے۔ اور اپنے آپ کو ایک بالاتر قوم سمجھتے تھے۔ انہیں اپنے علاقہ کے جاٹ زمینداروں کو بیٹی دینے سے عار تھا۔ ان میں بڑے بڑے متموّل اور بارسوخ لوگ تھے۔ انہیں میں ایک اونچے گھرانے کا دولت مند زمیندار چوچک نام تھا۔۔۔۔۔

چوچک کی نوخیز اور مہ جمال بیٹی کا نام ہیر تھا۔ اسے اتفاق کہیے یا کرشمہ قدرت کہ رانجھا چناب کو عبور کر کے جب جھنگ کی طرف اترا تو اس علاقے میں سب سے پہلے اس کا سامنا ہیر ہی سے ہوا۔ دونوں پر حسن و شباب کا عالم۔ رانجھا اپنے من کا لاڈلا، ہیر گھر بھر کی چہیتی۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں اور پھر جھک کر رہ گئیں۔ اس اعترافِ شکست میں شاید منظر کی دل فریبی اور ہوا کی خوبی کو بھی دخل تھا۔ جھنگ سیال میں آڑو پکے ہوئے تھے اور باغوں میں میٹھی داکھ کے خوشے لٹک رہے تھے۔ جو کچھ پیش آیا۔ اس کی توجیہہ کچھ بھی ہو۔ دریا کنارے کی اس ملاقات کا نتیجہ اتنا ضرور نکلا کہ چوچک نے ہیر کی سفارش پر رانجھے کو اپنی بھینس چرانے کے لئے کہا اور رانجھا نے یہ نوکری بخوشی منظور کی۔

اس طرح ہیر اور رانجھا دونوں کی زندگی میں ایک نیا باب شروع ہوا۔ رانجھا اپنی بھینسوں کو لے کر دریا کے بیلے میں جاتا۔ اور ہیر بھی کسی نہ کسی بہانے اسی طرف جانکلتی۔ بیلے کے جھنکاڑوں کے درمیان رانجھا کی بانسری کی لے عجیب اثر رکھتی تھی۔ ہیر محو ہو کر سنتی رہتی۔ دونوں ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے گئے۔ دریا کنارے ملاقاتیں ہونے لگیں آخر دونوں میں محبت کے قول و قرار ہو گئے لیکن محبت کا قول حقیقی زندگی کی تلخیوں کا مداوا نہیں کر سکتا۔ ایسے موقع بھی آتے کہ رانجھا کی طبع نازک پر اپنی نوکری کی ذلت گراں ہو جاتی۔ ہیر کا باپ یا بھائی اُسے کوئی نا ملائم لفظ کہہ دیتا۔ تو اس کا جی چاہتا کہ جھنگ سیال سے بھی اُسی طرح رخصت ہو جائے جس طرح اس نے کبھی تخت ہزارہ چھوڑا تھا لیکن ہیر کی منتیں اور تسلیاں اُسے کچھ نہ کرنے دیتیں۔ کبھی ہیر یہ بھی کہہ دیتی کہ اگر تو جاتا ہے تو میں بھی جاتی ہوں۔ اس پر

رانجھا بے بس ہو کر رہ جاتا۔ اسی طرح برسوں گزر گئے۔ رانجھا مشقت کا عادی نہ تھا۔ اس کے لئے چرواہے کا کام خوب تھا۔ دوسری طرف چوچک کے لئے بھی ایسے ملازم کا وجود غنیمت تھا جو برسوں تک تنخواہ کا نام نہ لیتا تھا۔ ان حالات میں اگر کوئی انقلاب نہ آتا تو رانجھا شاید اسی روش پر زندگی کے دن ختم کر دیتا۔ لیکن واقعات ایک نیا پلٹا کھانے والے تھے۔ ہیر اور رانجھا کی جنگل کی ملاقاتیں اب کئی لوگوں کی نظروں میں آ چکی تھیں۔ انہیں میں ہیر کا چچا کیدو بھی تھا۔ یہ شخص اپنے شبہ کی تصدیق کے لئے بیلے میں پہنچا اور چھپ کر ہیر اور رانجھا کو دیکھتا رہا۔ اُس کا حال خدا کو معلوم ہے کہ خاندانی غیرت نے تقاضا کیا۔ یا خُبثِ باطن نے جوش مارا۔ بہر حال اس شخص نے ہیر کے والدین کو خبر دی اور زور لگایا کہ کوئی مناسب رشتہ ڈھونڈ کر ہیر کی شادی جلد از جلد کر دی جائے۔

ضلع مظفر گڑھ میں کھیڑے راجپوتوں کا ایک سر برآوردہ خاندان رنگ پور کے قصبہ میں آباد تھا۔ رنگ پور کے کھیڑے جھنگ کے سیال راجپوتوں ہی کی برادری سے تھے۔ ہیر کے لئے بَر کی تلاش ہوئی تو کھیڑوں میں سیدا نامی ایک شخص مل گیا۔ ہیر نے اُس شادی کو روکنے کے لئے جو کچھ کیا ہو گا۔ وہ ظاہر ہے۔ لیکن آخر کار سیدا برات لے کر پہنچا اور ہیر ایک نارضامند دُلہن کی حیثیت سے رنگ پور کو روانہ ہو گئی۔ رانجھا غم سے نڈھال پھر بھٹکتا ہوا اُلٹے قدم چلا۔ لیکن اب وطن میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ آگے بڑھا اور جہلم کے قریب جا نکلا۔ یہاں وہ کان چھدوا کر بالناتھ جوگی کے چیلوں میں شامل ہو گیا۔ رانجھا خاصے عرصے تک گرو بالناتھ کی حضوری میں رہا لیکن پھر ہیر کی کشش غالب آئی اور اسی طرح جوگی بنا ہوا رنگ پور کی گلیوں میں پہنچا۔ آخر ہیر سے ملاقات ہوئی۔ اور ایک عجیب اتفاق سے خود ہیر کی نند سہتی نے ہیر رانجھا کو رنگ پور سے فرار ہونے میں مدد دی۔ کھیڑوں نے تعاقب کیا اور اس سرگرمی سے دوڑے کہ ہیر اور رانجھا کو جا بھی لیا لیکن وہ دونوں پھر بھی اُن کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اب اِن کے لئے دو ہی راستے کھلے تھے۔ اپنے مستقبل کا فیصلہ اپنے ہاتھوں سے کریں یا ہیر کے والدین کے پاس پہنچ کر انکی اجازت اور رضامندی سے اپنی نئی زندگی کو ڈھالیں۔ ہیر کے اصرار پر یہی دوسری صورت اختیار

کی گئی۔ ہیر اور رانجھا پھر جھنگ سیال پہنچے۔ نیک دل اور صاف باطن چوچک اپنی بیٹی کی خاطر اس انتظام پر رضامند ہوگیا۔ کہ ہیر کی شادی رانجھا سے ہوجائے۔ لیکن اب کیدو پھر نمودار ہوا۔ شاید وہ زہریلی فطرت کے اُن لوگوں میں سے تھا جو دوسروں کی خوشی کو دیکھ نہیں سکتے۔ اُس نے اپنی شرارت کا جال بچھایا۔ اور بھولے بھالے چوچک کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ ہیر کو زہر دے کر قضیہ ہمیشہ کے لئے ختم کردیا جائے۔ رانجھا سے کہا گیا کہ وہ باقاعدہ برات لانے کے لئے اپنے وطن کو جائے اور جب وہ رخصت ہوگیا تو ہیر کی زندگی ختم کردی گئی۔

جب رانجھے کو یہ خبر پہنچی تو اس کی حالت مُردوں سے بدتر ہوگئی۔ اس کے ہاتھ بار بار دُعا کے لئے اُٹھتے تھے کہ "اے خدا اگر ہیر زندہ نہیں ہوسکتی تو مجھے بھی اٹھالے"۔ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ اس کی دعا قبول ہوئی اور وہ خود ہیر کے پاس جا پہنچا۔ اس طرح عشق کی محرومی اور زندگی کی نامرادی کی یہ داستان ختم ہوتی ہے۔ رحم اور خوف، یہ دو جذبے اس کہانی کی ساخت میں اس طرح بُنے گئے ہیں کہ اسے خود بخود دنیا کی بڑی بڑی المیہ کہانیوں میں جگہ ملتی ہے۔ اس کہانی کی واقعیت کے ساتھ ساتھ اس کی سادگی اور برجستگی فوراً سننے والے کے دل میں جگہ بناتی ہے۔ ان فنی خصوصیتوں سے قطع نظر کچھ ہر دل عزیز اخلاقی تصورات پر اس کہانی کے اہم واقعات کی بنیاد ہے۔ ان اخلاقی تصورات میں سب سے نمایاں، خلوص، وفا، استقلال اور ہمت ہیں۔ ان سب خوبیوں نے مل جل کر پنجاب کے عوام، بالخصوص قصباتی حلقوں کے عوام کی شعری حس کو بیدار کیا اور اُن کے تخیل میں ایک آگ سی لگادی۔ سولہویں صدی میں پنجاب کی تہذیبی اور درباری زبان فارسی تھی۔ لیکن ہیر اور رانجھا کے عشق کو کسی دربار سے تعلق نہ تھا۔ یہ تمدن کے زراعتی دور کی کہانی ہے جس کا محور درباروں کے بجائے گاؤں اور کھیت، دریا اور وادیاں ہیں۔ جو لوگ یہ زراعتی زندگی بسر کر رہے تھے اُن کے لئے ہیر رانجھا کی کہانی ایک پیغام بن کر آئی۔ انہوں نے اپنی پنجابی بولی میں دل سے نکلے ہوئے گیت ہیر اور رانجھا کے متعلق لکھے۔ لیکن یہ گیت محض لوک گیت تھے، ان کی حیثیت ادبی نظموں کی نہ تھی۔ کسان ہل چلاتے ہوئے اور اُن کی بیویاں چکّی پیستی ہوئی یہ

گیت گاتیں۔ اس طرح دو سو برس گذر گئے۔ اور ہیر رانجھا کی کہانی نے پنجاب کے اضلاع میں ایک قومی روایت کی سی مقبولیت حاصل کرلی۔ اٹھارھویں صدی میں مغلوں کے زوال کے ساتھ فارسی زبان کو بھی زوال آیا اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف بولیوں نے سر نکالا جس طرح دہلی کی مقامی بولی نے اردو بن کر فارسی کی جگہ لی۔ اسی طرح مغربی پنجاب میں بھی خود اس علاقے کی بولی ادبی کاوش کا موضوع بنی۔ میر اور سودا کا پنجابی ہم عصر وارث شاہ ہے۔ جس نے فارسی کے زوال کے بعد اپنے دہلوی معاصرین کی طرح زبان و ادب میں ایک ترقی پسندانہ قدم اٹھایا۔ اس نے اپنی عظیم الشان پنجابی نظم کے لئے ہیر اور رانجھا مقبولِ عام قصہ انتخاب کیا۔ اور اسے دیہاتی پنجاب کی زندگی کے رس میں اس طرح سمویا کہ اس کا مزا آج بھی ویسا ہی تازہ ہے۔

ہیر اور رانجھا کے کردار رفتہ رفتہ ایک تمثیلی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ پنجاب کے صوفی شعرا نے دو سو برس پہلے ہیر اور رانجھا کے عشق کی تعبیر عارفانہ رنگ میں کی۔ ہیر بارہا معشوقِ حقیقی کی علامت بنتی ہے۔ اور رانجھا عارفِ کامل کی۔ خود وارث شاہ نے اپنی نظم کے خاتمہ پر پوری داستان کو ایک تمثیلی مفہوم پہنانے کی کوشش کی ہے۔ ہیر روح ہے اور رانجھا جسم۔ کیدو شیطان ہے اور کھیڑا عزرائیل۔ اسی طرح دوسرے کردار اس تمثیل میں اپنی اپنی مخصوص جگہ رکھتے ہیں۔ لیکن جس طرح اصل واقعہ پہلے پیش آیا اور عارفوں کی تعبیریں بعد میں پیدا ہوئیں۔ اسی طرح وارث شاہ کی نظم میں کہانی کے لطف کو اولیت حاصل ہے۔ اگر آپ شاعری کی تمثیلی تعبیر سے ذوق رکھتے ہیں۔ تو یہ آپ کے لئے کہانی کے لطف پر ایک نیا اضافہ ہے۔ آپ اس تمثیل کی روشنی میں ہیر کے مقبرے تک چلے آئیں۔ تو کچھ نئے نکتے آپ کے ذہن پر منکشف ہوتے ہیں۔ اس مقبرے کی چھت کھلی ہے۔ گویا روح کے لئے زمین سے لے کر آسمان تک کی وسعتیں کھلی پڑی ہیں۔ اس مقبرے کے تین دریچے کھلے ہیں۔ اور ایک ہمیشہ بند رہتا ہے۔ اس بند دریچے کا رخ کھیڑوں کے وطن رنگ پور کی طرف ہے۔ گویا روح انسانی کائنات کے تمام حدود کا نظارہ کرتی ہے۔ صرف موت کا دروازہ اس پر بند ہے۔

کیونکہ اب وہ جاودانی زندگی میں داخل ہو چکی ہے۔

پنجاب کے عوام میں ہیر اور رانجھا کو ولیوں کی سی عزت حاصل ہے۔ ہیر کے مقبرے پر اسی طرح سالانہ عُرس ہوتا ہے، اُسی طرح منتیں مانی اور دعائیں مانگی جاتی ہیں، جس طرح اولیاء اللہ کے مزاروں پر۔ اور پھر ان منتوں اور دعاؤں کے موضوع پر نئی حکایتیں اور نئے گیت پیدا ہوتے رہتے ہیں۔!

ھیر سیال

سیّد وارث شاہ
مترجمہ: رفیق خاور

لے کے ساٹھ سہیلیاں ساتھ آئی ہیر روپ گمان کی متوالی
موتیا روک بھر کانوں میں جھولتا تھا کسی حور پری کی شان بھاری
لال کرتی پھبتی تھی سینے پر، اڑا ہوش زمین آسمان کا بھی
بلاق ناک میں جیسے قطب تارا، ڈوبی حسن کے غضب طوفان میں تھی
اے بندوں والی، آٹل جا تو، آگے کُٹی گئے تنبو تان کے ری!
وارث شاہ میاں! اجی غضب کی وہ بھری کبر، گھمنڈ اور مان کی تھی

ھیر کا حسن

کیا ھیر کی کرے تعریف شاعر، چمک ماتھے پر مہتاب کی تھی
خونی چوٹیاں، چاند کے گرد جیسے شب کو سرخ لکیر شہاب کی تھی
نین نرگسی، ہرن، ممولے کے، لہک گالوں میں پھول گلاب کی تھی
بھنویں جیسے کمان لاہور کی ہو، حد کوئی نہ حسن شباب کی تھی
سرمہ نینوں کی دھار میں پھبتا ہوا چڑھی ہند پہ فوج پنجاب کی تھی
ساتھ سکھیوں کے جھولتی آئی تھی، پر جھولتی شان عقاب کی تھی

کھلم کھلا ترنجنوں میں گھومے جیسے ہتھنی مست نواب کی تھی
جو تھے دیکھنے کے مشتاق اسکے، اک قیامت ان کے باب کی تھی
سندر چہرے پہ نقش و نگار پیارے، خوشخطی یہ حرف کتاب کی تھی
چلو لیلۃ القدر کی کرو زیارت، وارث طلب یہ کار ثواب کی تھی

ھیر کے نقش و نگار

ہونٹ شوخ یاقوت کہ لعل چمکیں، ٹھوڑی سیب ولایتی دیار میں سے
دانت چمبے کی لڑی کہ ہنس موتی، دانے نکلے حسن انار میں سے
ناک تیغ حسینی کی نوک تیکھی، زلف ناگ خزانے[1] کی بار میں سے
چینی نقش کشمیر کی جٹی کا، قد سرو، بہشت گلزار میں سے
گردن کونج کی، انگلیاں روانہہ[2] پھلیاں ہاتھ نرم سے برگ چنار جیسے
سرخی ہونٹوں کی، دھوم دنداسے کی، خوجے، کھتری قتل بازار میں سے
باہیں ڈال کے مکھن بلی ہوئیں، سینہ سنگ مرمر گنگ[3] دھار میں سے
شاہ پری کی بھین پنج پھول رانی، چھپی رہے نہ ھیر ہزار میں سے
ساتھ سکھیوں کے مٹکتی مان بھری جیسے ہرنیاں تیز ہوں بار میں سے
لنکا باغ کی پری کہ اندر رانی، حور نکلی چاند کی دھار میں سے
گڑیا چین کی، نقش تھے روم والے، اتراپری یہ چاند اجار میں سے
جیسے غضب کی تیز تلوار چمکے، یکلخت میان کی دھار میں سے
جو کوئی دیکھتا حسن جمال اس کا کھاتا زخم ہزار تلوار میں سے
عاشق بھونرے جوان کے لگیں ماتھے، نکل جائیں تلوار کی دھار میں سے

---

[1] بار کے علاقے میں زہریلے سانپوں کی مشہور جگہ [2] لوبیا [3] گنگا کے کنارے پہاڑی جگہ

عشق بولتا لڑکی کا جگہ جگہ، راگ نکلے ساز کے تار میں سے

بپھرے جھنکتی شان کے ساتھ جٹی، چڑھی غضب کی فوج قندھار میں سے

دیکھیں کیا کچھ ہم کو دکھائے خدا، ان کنواریوں کی الوکار[1] میں سے

قزلباش جلاد سوار خونی نکل دوڑا اُرڈو بازار[2] میں سے

وارث شاہ! جب نینوں کا داؤ لگے، کون بچے گا اس پیکار میں سے

---

[1] - الوکار - فوج کا جمگھٹا جو دوسری فوج کے مقابلے پر ہوتا ہے۔

[2] ارڈو بازار - اردو بازار یعنی چھاؤنی کا بازار

مرزا صاحباں

سیّد عابد علی عابد

پنجاب کے جتنے مشہور رومانی قصے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق اس پُراسرار علاقے سے ہے۔ جسے "بار" کہتے ہیں۔ "بار" کے علاقے کے بعض حصوں کو چناب سیراب کرتا ہے۔ پُرانے وقتوں سے یہ علاقے جفاکوشی اور گرم جوشی کے لئے مشہور ہیں۔ "ہیر رانجھا کی داستان" "مہتی مراد" کا قصہ، "راجہ رسالو" کا رومان۔ سوہنی مہینوال کا المیہ، مرزا صاحباں کی کہانی، ان ہی علاقوں سے تعلق رکھتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب دینا مشکل نہیں۔ بات یہی ہے کہ جنس اور جنس کا سب سے دلفریب اظہار یعنی عشق، انسانیت کے دو بنیادی جذبوں میں سے ہے۔ شہروں میں تعلیم و تادیب جہاں اس جذبے کو سنوارتی اور نکھارتی ہے اور بال کی کھال نکالتی ہے۔ وہاں جذبے کے بے باک اظہار کو دبا بھی دیتی ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے شہروں کا عشق وہاں کے شہریوں کی طرح کچھ زرد۔ زرد کچھ مریض، کچھ ناتواں سا ہوتا ہے شہروں میں کچھ تمدنی ماحول اور دوسرے اثرات کی وجہ سے نڈر اور بے باک عشق کم ملتا ہے۔ البتہ نفسیاتی اُلجھنوں میں گھری ہوئی محبت زیادہ پائی جاتی ہے۔ "بار" کے علاقوں میں ایسی کوئی اُلجھن نہیں۔ وہاں سیاہ کو سیاہ اور سپید کو سپید ہی کہتے ہیں۔ عشق ہو گیا ہو گیا۔ عشق پر کسی کا اختیار تو ہے نہیں۔ پھر وہاں جب عشق ہوتا ہے۔ وہاں کے رہنے والوں کی طرح صحت مند، توانا، آتشیں اور رنگین ہوتا ہے چنگاری وہاں نہیں سلگتی۔ آگ لگتی ہے اور آگ اس گھر میں

لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا" والا معاملہ پیش آتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس علاقے سے دریائے چناب کو خاص تعلق ہے۔ اسی کے کنارے نوجوان دوست۔ اور بے تکلف سکھیاں وہ گیت گاتی ہیں۔ جس سے اس علاقے کی سخت کوش محبت کے مختلف رنگ ملے جلے ہوئے اس طرح جھلکتے ہیں جس طرح کسی نوجوان کی صحت مند جلد میں مختلف رنگوں کا تال میل ہوتا ہے یہاں ذہن سے نغمے اُبلتے ہیں۔ ہوائیں گیت گاتی ہیں۔ اور سہیلیاں مل کر یہ بول سُناتی ہیں:۔

"ہیر نوں فقیر نال ٹور دے، سبھتی مراد پائیں گی"

اور برہ کی ماری کامنی ساجن کو یوں آواز دیتی ہے۔" ڈاچی والیا موڑ مہار وے تیری ڈاچی دے گل وچ ٹلیاں۔ میں تے رُٹھڑے ساجن نوں مناون چلیاں" گانے والوں نے گیت بنانے والوں۔ خیال، ٹھمری اور ٹپہ لکھنے والوں نے ان داستانوں سے ہمیشہ ایسے بولوں کو رنگین کیا پنجاب کی موسیقی میں ان کی روح رچی ہوئی ہے۔ آساوری کا مشہور خیال ہے:" مجھی والڑیا سائیاں سانوں تیری تانگ اے" یہ تو ہیر کی درد بھری آواز ہے بستی سہاگ کے دل فریب نغموں کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ سہاگ کا خیال ہے" ڈاڈا اہی پے گیا وے ہیچ اولڑا نی میں کانوں گلاں کیتیاں بلوچاں دے نال"۔ یوں تو یہ تمام علاقہ اسی قسم کی رومان خیزی اور عشق انگیزی کے لئے مشہور ہے لیکن جھنگ اور اس کے آس پاس کا علاقہ اور وہاں کے رہنے والوں میں سے سیال تو گویا ان داستانوں کے لئے مخصوص ہو گئے ہیں۔ ہیر رانجھا اور مرزا صاحباں دونوں داستانوں کا تعلق سیالوں کے خاندان سے ہے۔ اس کی وجہ دریافت کرنا بھی کوئی مشکل نہیں۔ مورخ بالاتفاق و تکرار لکھ رہے ہیں کہ سیال نسلاً راجپوت ہیں۔ راجپوتوں کے یہاں قدیم الایام سے بیاہ شادی کے معاملے میں عورتیں نسبتاً زیادہ آزاد رہی ہیں۔ پھر جب راجپوت" بار" کے علاقوں میں آباد ہوئے ہوں گے۔ جہاں کا جغرافیائی ماحول اور آب و ہوا صحت مند اور توانا انسانوں کی پرورش کے لئے مشہور ہے۔ تو اندازہ کر لیجئے کہ یہ شرب دو آتشہ ہو کر کتنی تیز ہوئی۔ ایک تو نیناں دے بھرے اور دوجے انجن سار کوئی دیت ہے باورے متوارے ہتھیار۔" مرزا صاحباں کی داستان جسے بہت سے شاعروں نے نظم کیا

ہے اور جس کے ٹکڑوں نے گیتوں۔ ٹھمریوں اور ٹپوں کو غیر فانی سوز بخشا ہے۔ کوئی غیر معمولی داستان نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ مرزا اور صاحباں کے درمیان عشق کا رابطہ قائم ہو گیا۔ توانا، صحت مند اور بے باک عشق۔ اسی نے اس قصے کو غیر معمولی بنا دیا۔ مرزا راوی کے کنارے بسنے والے کھرلوں کے قبیلے کا ایک بانکا تیکھا سجیلا نوجوان تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی ماں جھنگ کے خاندان سے تھی۔ اور غالباً ماہی سیال کی بہن تھی۔ جو کھیوا خان بھی کہلاتا تھا۔ کھیوا جھنگ سے شمال کی طرف بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ روایتوں کا بیان ہے اور کسی حد تک تاریخ بھی ہم زبان ہے کہ صاحباں اسی ماہی سیال یا کھیوا خاں کی لڑکی تھی۔ دونوں یعنی مرزا اور صاحباں مکتب میں داخل کرا دیئے گئے۔ لیکن مکتبِ عشق میں جو ہوتا ہے کیا یاد رہے۔ نہ لکھا یاد رہے۔ اور نہ پڑھا یاد رہے۔ ابھی دونوں جوانی کے پُرآشوب دور میں داخل بھی نہ ہوئے تھے کہ دونوں کی محبت کے چرچے وردِ زبان ہوئے اور پھر زیب داستان ہوئے۔ بدنامی ہوئی۔ اور قبیلے کے بڑے بوڑھوں نے مل کر معاشرت کے پُرانے اصولوں کے مطابق فیصلہ کیا کہ اب دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے لیکن ان دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی۔ بس فیصلے کی صحت یا عدم صحت سے بحث کرنا بیکار ہے۔ فیصلہ ہو چکا اور اسی فیصلے نے مرزا صاحباں کی تقدیر کا بھی فیصلہ کر دیا۔ جب مرزا کے لئے کھیوا میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ تو وہ بادلِ ناخواستہ دانا باد پہنچا کہ اس کا آبائی وطن تھا۔ اب کہنا مشکل ہے کہ یہاں اُس کے دل پر کیا بیتی۔ شاید بھڑکتی ہوئی آگ چنگاری بن کر رہ گئی۔ یا شاید اس آگ نے ہر شے کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اِدھر خاندان کے بڑے بوڑھوں نے صاحباں کو جلتی آگ میں جھونکنے کے انتظام پورے کئے۔ قبیلہ چنڈاں کا ایک کھاتا پیتا زمیندار طاہر خاں تھا۔ اس سے صاحباں کی منگنی کر دی گئی۔ تاریخ کہتی ہے کہ غالباً چنڈاں کا قبیلہ وہی ہے جس کے نام پر چنیوٹ ابھی تک آباد ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اس منگنی کی خبر سُن کر بھی چُپکا ہو رہا۔ یہاں تک کہ صاحباں نے گاؤں کے نائی کموں کو بُلا کر یہ پیغام دیا " مرزا سے کہیو کہ صاحباں کی شادی کا وقت آن لگا ہے۔ مہندی گھولی جا رہی ہے۔ صاحباں نے تجھے بلا بھیجا ہے۔ تو بھی آ کر ہاتھوں کو مہندی رچا لے"

مرزا نے یہ سُنا تو کیل کانٹے سے لیس ہو کر بڑی سج دھج سے، بڑے بانکپن سے ملنے کے لئے تیار ہوا۔ بڑے بوڑھوں نے بہت اونچ نیچ سمجھائی۔ ڈرایا دھمکایا۔ ماں نے آنسو بہائے۔ دوستوں نے ہمدردانہ مشورے دیئے ؎

آخر وہ بھی زمانے آئے　　　لوگ ہمیں سمجھانے آئے

مرزا نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ اپنی برق رفتار گھوڑی پہ کاٹھی کس، یہ جا وہ جا۔ ہوا ہو گیا۔ تقدیر کی کمان سے یہ تیر نکلا۔ اور سیدھا صاحباں کے دل میں پیوست ہو گیا۔ کھیوا پہنچا تو معلوم ہوا کہ دھوم دھام سے بیاہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مرزا پہلے اپنی خالہ بیبو کے گھر گیا۔ خالہ نے بھانجے کو گلے لگایا۔ سمجھایا بجھایا۔ لیکن مرزا کے دل پر نہ اثر ہونا تھا نہ ہوا۔ وہ یہی رٹ لگاتا رہا کہ مجھے ایک بار صاحباں سے ملا دے۔ بیبو مجبور ہو کر صاحباں کو بلالائی۔ اُسی ملاقات نے دونوں کی تقدیر پر شدنی کی آخری مہر بھی لگا دی۔ مرزا نے کہا۔ "صاحباں میرے جیتے جی یہ کس طرح ہو گا کہ کوئی تجھے لے جائے اور میں منہ دیکھتا رہوں۔ کیا محبّت کے پیمان جھوٹے تھے۔ وہ میٹھی میٹھی باتیں فریب تھیں۔ وہ زمانہ خواب تھا۔ وہ قول و قرار غلط تھے"۔ صاحباں نے کیا جواب دیا ہو گا۔ اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ خود اُس نے تو مرزا کو بُلا بھیجا تھا۔ طے یہ ہوا کہ رات کو مرزا صاحباں کو لے کر دانا باد روانہ ہو جائے۔ ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم کے مقولے پر عمل کیا جائے۔ ان بچاروں کو کیا خبر تھی کہ جو لوگ اس طرح محبت کی کشتی کھیتے ہیں وہ ڈوب کر رہتے ہیں۔ اور خبر بھی ہو تو ان کی پروا کون کرتا ہے۔ میرؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

شناورانِ محبت تو سینکڑوں ہیں مگر　　　جو ڈوب جائے وہ پکا ہے آشنائی کا

روائیتیں کہتی ہیں۔ کہ مرزا نے صاحباں کے گھر کی پچھلی دیوار پر ایک ہزار کھونٹیاں گڑوا دیں۔ وہ رات عجیب قیامت خیز رات تھی۔ صاحباں کے گھر تیل چڑھانے کی پرانی اور پُر اسرار رسم ادا کی جا رہی تھی۔ سکھیاں سہیلیاں چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹی ہوئی ڈھولے اور گیت گا رہی تھیں۔ نائی اور نائنیں اندر باہر آ جا رہے تھے۔ باہر گاؤں کے بڑے

بوڑھے اور نوجوان سر پر یہ بڑے بڑے پگڑ باندھے حقہ منہ سے لگائے پُرانے وقتوں کی داستانیں کہہ رہے تھے۔ نوجوان مونچھوں پہ تاؤ دے دے کر بظاہر سُن رہے تھے۔ اور سر دُھن رہے تھے۔ لیکن دلوں میں سوچ رہے تھے۔ کہ کیا واقعی مرزا اتنا بے غیرت ہے کہ وہ اس بات کی اجازت دے گا کہ صاحباں طاہر خان سے بیاہی جائے۔ کیا واقعی طاہر خان کل صاحباں کی ڈولی لے جائے گا۔ ادھر تو یہ رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں۔ ادھر صاحباں چپ چاپ کھونٹیوں پر سے اتری اور مرزا کے ساتھ ہولی۔ روایتیں کہتی ہیں کہ اس واقعہ کا علم پہلے صاحباں کے ماموں ڈوگر فیروز کو ہوا۔ اُس نے کھیوا خان سے جا کر کہا "کھیوا خان آج مرزا نے سیالوں کے منہ پر بڑے زور کا طمانچہ مارا ہے۔ اس نے ہماری لاج کو نہایت فحش گالی دی ہے۔ اس نے گاؤں کی آبرو کو مٹی میں ملا دیا ہے۔ وہ صاحباں کو لے بھاگا ہے۔" اس کی بات سُن کر صاحباں کے بھائی اور دوسرے قریبی رشتہ دار آگ بگولا ہو گئے۔ ترکشوں میں تیر ڈالے۔ ہتھیار سنبھالے۔ گھوڑیوں پہ کاٹھیاں کسیں۔ مرنے مارنے پر تیار ہو کر نکلے۔ ہر ایک نے دل میں قسم کھائی کہ آج مرزا کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔ ادھر مرزا کی سُنیئے۔ یہ نازوں کا پلا البیلا متوالا نیند کا رسیا آرام کا ماتا۔ صاحباں کو لے کر نکلا اور کچھ رستہ طے کر لیا تو کہنے لگا۔ صاحباں مجھے نیند آتی ہے۔ صاحباں کا ماتھا ٹھنکا کہ ایسے وقت میں نیند۔ یہ نیند کہیں کسی زیادہ گہرے خواب کا شگون نہ ہو۔ اس نے کہا۔ مرزا یہ سونے کا وقت نہیں۔ دانا باد پہنچ لے۔ پھر جتنا تیرا جی چاہے سو لیجو۔ اس وقت قسمت سوئی ہوئی ہے۔ ہمارے جاگنے کا وقت ہے۔ مرزا نوجوان تھا۔ اسے اپنی سرداری پہ نوجوانی پہ مان تھا۔ نہ مانا۔ جنڈ کے ایک درخت تلے لیٹ ہی گیا صاحباں نے اس کا ترکش ایک شاخ سے لٹکا دیا۔ پاس بیٹھ گئی۔ ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر گہری سوچ میں غرق کہ یہ عجیب الھڑ نوجوان ہے۔ موت تعاقب کرنے والوں کی شکل میں سرپٹ دوڑی آ رہی ہے۔ اور یہ سو رہا ہے۔ وہ مرزا کو چونکاتی رہی۔ جگاتی رہی۔ جھنجھوڑتی رہی۔ مرزا ہر بار یہی کہتا رہا۔ صاحباں مجھے ذرا سو لینے دے۔ میری آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے۔ مجھے نہ ستا۔ یہ کیفیت تھی کہ دور سے غبار کا ایک طوفان اٹھا۔ صاحباں نے کہا۔ مرزا پیچھا کرنے والے آ پہنچے۔ ان میں میرے بھائی ہیں۔ جن کی تلواریں ایک وار میں قوی ہیکل نوجوانوں کے دو ٹکڑے کرتی ہیں۔ ان کے

تیر سینوں کو چھید کر دلوں میں اترتے ہیں۔ مرزا نے کہا صاحباں خوف نہ کھا۔ ان کو قریب تو آنے دے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ شمیر کی گھوڑی آگے آئی۔ پیچھا کرنے والوں نے تیر باراں کیا۔ اب مرزا چونکا۔ اس نے بھی کمان میں ایک تیر جوڑا۔ کمان کڑکی تیر نکلا، ہوا کو چیرتا ہوا شمیر کی گھوڑی پہ لگا۔ صاحباں کا بھائی اوندھے منہ گرا۔ مرزا نے کہا۔ وہ مارا۔ ان کی کیا مجال کہ میرا راستہ روکیں۔ یہ کہکر پھر لیٹ گیا۔ صاحباں۔ نے چیخ کر کہا "مرزا، مرزا، یہ پیچھا کرنے والے سوار نہیں موت کے فرشتے ہیں"۔ یہ بات صاحباں کے منہ میں تھی کہ تیروں کی بوچھاڑ آئی۔ ایک کاری تیر مرزا کے لگا۔ اور اسی جنڈ کے گھنے سائے تلے مرزا کا دم سینے میں اٹک گیا۔ روح کھنچ کر آنکھوں میں آگئی۔ صاحباں کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور کہا "افسوس صاحباں تو نے میرا ترکش شاخ پر کیوں لٹکا دیا تھا۔ مجھے سیالوں نے نہیں مارا تو نے مارا ہے"۔ صاحباں نے کہا "مرزا نہ میں نے تجھے مارا نہ سیالوں نے، نیند کے ماتے تجھے تیری غفلت نے اور ہم دونوں کو محبت نے مارا، عشق نے ہلاک کیا"۔ مرزا نے کہا "سچ ہے"۔ اور پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ صاحباں کے چہرے کی طرف دیکھا اور مرنے سے پہلے آخری بار مسکرایا۔ روایتیں کہتی ہیں کہ اس کے بعد بھی تیروں کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔ اور صاحباں روتی رہی۔ اور بین کرتی رہی۔ مرزا کی لاش سے لپٹتی رہی۔ یہاں تک کہ تیروں نے اُسے بھی چھلنی کر دیا۔ اور دونوں کی محبت کی کشتی ابد کے کنارے تک پہنچی۔ دونوں مر گئے لیکن دونوں کی داستان اب تک گیتوں کے بولوں میں لہراتی ہے۔ اور ٹھمریوں اور خیالوں میں اپنا روپ دکھاتی ہے۔ شاعر اپنی داستانوں میں اس کو افسانے کا رنگ بھرتے ہیں۔ اور "بار" کے رہنے والے درختوں کی گھنی چھاؤں میں اب تک ان دونوں کو یاد کرتے ہیں

سوہنی مہینوال

صوفی غلام مصطفٰے تبسّم

"ہیر رانجھا" کے بعد غالباً سب سے زیادہ مقبولِ عام کہانی "سوہنی مہینوال" ہے۔ عشقیہ داستان ہونے کے علاوہ اس کی بنیادی ساخت میں سادہ فطری عناصر بہت نمایاں ہیں۔ اور یہی سادگی اور فطری پن اسے ہمیشہ تازہ رکھتا ہے اور اس کی کشش ہمیشہ کے لئے دلوں کو اپنا گرویدہ کرلیتی ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاں شاعر اپنے شعر سے داستانوں کو چمکاتا ہے۔ وہاں کبھی کبھی داستان بھی شاعر کے نام کو چمکاتی ہے۔ ہیر رانجھا، سسّی پنوں، سوہنی مہینوال، یہ سب عشق و محبت کے افسانے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے سب کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ ہر ایک سننے والا ان داستانوں میں اپنے ہی جذبات کے ابھرتے ہوئے نغمات کی آواز سنتا ہے۔

لیکن تقدیر دیکھئے "ہیر رانجھا" کے قصّے کو وارث شاہ جیسا رمز آشنا شاعر ملا، اور "سسّی پنوں" کی داستان ہاشم شاہ اہلِ دل کی زبان سے بیان ہوئی۔

وارث شاہ ایک سحر طراز تھا، اُسے زبان پہ بے پناہ قدرت تھی۔ انسانی دلوں کے پوشیدہ گوشوں کو ٹٹولنے کا ڈھب آتا تھا۔ اُس کے قلم نے ہیر رانجھا کی کہانی کو ایک زندہ حقیقت بنا دیا۔

ہاشم شاہ ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ اُن کے دل میں گداز، اور زبان میں رس بھرا تھا۔

سسّی پنوں کی داستان سے جذبات کا رس نچوڑ کر نغموں میں بھر دیا۔

سوہنی مہینوال کی کہانی فضل شاہ کے حصے میں آئی۔ یہ کہانی جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا دوسری دو کہانیوں سے کہیں زیادہ سادہ، فطری اور دل کش تھی۔ فضل شاہ قادر الکلام تھے لیکن اُن کی قادر الکلامی اُن کی دوسری شاعری میں کام نہ آسکی۔ اُن کے دوسرے رومان فنی صنعت کاریوں سے آگے نہ بڑھ سکے۔ سوہنی مہینوال کی داستان میں شعریت، ڈرامائی عناصر جذبات کی فراوانی، سبھی کچھ موجود تھا۔ نظم میں آکر یہ تمام استعدادیں خود بخود اُبھر آئیں اور اُبھرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے مصنّف کو بھی اُبھارا۔

داستان کی اندرونی استعدادیں کیا تھیں؟ آیئے انہیں پرکھنے سے پہلے ذرا اس داستان کو دُہرا لیں۔

چناب کے کنارے گجرات کے شہر میں ایک کمہار رہتا تھا۔ کوزہ گری کے فن میں طاق۔ اس کے فنی کمالات کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی تھی اور اس شہرت نے اس کے گرد دولت کے انبار لگا دیئے تھے۔ دولت کے ساتھ ساتھ خدا نے اسے ایک اور نعمت بھی عطا کی تھی۔ وہ اس کی نوجوان حسین بیٹی تھی جس کے حسن و جمال کو سوہنی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

اسی زمانے میں بخارا میں ایک دولت مند سوداگر مرزا نامی رہتا تھا۔ بڑھاپے میں اولاد کو ترستا تھا۔ آخر ایک بزرگ کی دعا سے اس کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام عزت بیگ رکھا گیا۔ لڑکا ناز و نعمت میں پلا، جوان ہوا، ہنر مند تھا۔ تیر اندازی میں ماہر اور موسیقی میں یکتا۔ شاہجہاں کا زمانہ تھا۔ دلّی اپنے عروج پر تھی۔ مرزا عزت بیگ دلّی دیکھنے آئے۔ واپسی پر ہر بڑے شہر کی سیر کی، ہوتے ہوتے گجرات آئے اور یہاں پہنچ کر تلے کمہار کی صنعت گری کا شہرہ سُنا۔ دُکان پر گئے۔ اس کی دست کاری کے نمونوں میں قدرت کا شاہکار بھی دیکھا۔ سوہنی پہ نظر پڑی، فریفتہ ہو گئے۔

دریائے چناب کا کنارا۔ گجرات کی عشق خیز سرزمین۔ محبت کا بیج ایک ہی ساعت میں لگا، اُگا اور پھلا پھولا۔

محبوب کے دیکھنے کو بہانہ چاہیئے تھا۔ اور ہر روز کی خرید فروخت شبہ کی بات تھی گجرات ہی میں برتنوں کی ایک الگ دکان کھول لی۔ مہنگے برتن خرید کر سستے داموں بیچنے شروع کیئے۔ دولت کی فراوانی تھی لیکن آخر ختم ہوگئی۔ وفادار دوست، نوکر چاکر ساتھ تھے لیکن کب تک ساتھ دیتے۔ انہوں نے بہتیرا سمجھایا۔ لاکھ تدبیریں کیں لیکن کارگر نہ ہوئی۔ آخر ایک رات رہا سہا اثاثہ اٹھا کر چپکے سے چل دیئے اور اُسے تنہا چھوڑ گئے۔

عزت بیگ کو اس بیوپار نے زیر بار کر دیا۔ اور اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ تُلّے کے گھر میں نوکری کرے اور قرض کو ادا کرے۔ پہلے گھر کی صفائی اور پھر بھینسوں کی چروائی سپرد ہوئی۔ اور عزت بیگ سے مہینوال نام پایا۔

سوہنی اب تک مہینوال کے دل سے بے خبر تھی۔ جب اُسے پتہ چلا، اس کی تباہ حالی اور خستگی کو دیکھ کر تڑپ گئی۔ اب دونوں بے تاب رہنے لگے۔ لیکن محبت نے ابھی وحشت کا رنگ نہ پکڑا تھا کہ سوہنی کے ماں باپ کو راز معلوم ہو گیا۔ مہینوال کو نوکری سے جواب ملا اور وہ چناب کے دوسرے کنارے فقیر بن کے بیٹھ گیا۔ سوہنی کی شادی فی الفور برادری کے ایک نوجوان سے کر دی گئی۔

مہینوال شادی کا حال سُن کر مایوس ہوا۔ لیکن سوہنی نے ایک سہیلی کے ذریعے پیغام بھیجا اور اپنی محبت اور وفاداری کا یقین دلایا۔ مہینوال کے دل میں عشق کی چنگاری بھڑک اٹھی۔ وہ رات کو تیر کر اس سے ملنے کے لئے دریا کے اس پار آتا اور تازہ مچھلی بھون کر لاتا۔

ایک رات مہینوال آیا، اس میں قدرے نقاہت تھی، اور ٹانگوں سے خون بہہ رہا تھا۔ جستجو پر معلوم ہوا۔ مچھلی نہ ملنے کے باعث اس نے اپنی ران سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر کباب بنائے تھے۔

سوہنی محبت کے یہ انداز دیکھ کر سہم گئی۔

اب سوہنی مہینوال سے خود راتوں کو چھپ چھپ کے دریا کے پار ملنے کے لئے جاتی۔ بظاہر ایک گھڑے کے وسیلے تیرتی تھی۔ لیکن شوق بہت بڑا سہارا ہے، منزل کتنی

کٹھن کیوں نہ ہو۔ ایک جست میں طے ہو جاتی ہے۔ مگر آسمان کو یہ بھی گوارا نہ تھا۔ سوہنی کی نندیا کو شبہ ہوا۔ وہ اُس کے تعاقب میں گئی اور سب راز پا لیا۔ کچھ غیرت، کچھ حسد، کچھ تریا چلتر۔ سب نے مل کر انتقام کی صورت نکالی۔

ایک رات، آسمان پر مہیب بادل گھرے ہوتے تھے۔ تاریک فضاؤں میں ہولناک آندھیوں کا شورِ قیامت بپا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو لرز کر رہ جاتا۔ سوہنی محبت کا سہارا لے کر اٹھی۔ اور دریا کی طرف چل دی۔

کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے۔ بجلی نے کڑک کر، چمک کر بہت کچھ ڈرایا، سمجھایا، بجھایا، لیکن سوہنی نے سمجھا تو صرف اتنا کہ اس کے ہاتھوں میں پکا گھڑا نہیں کچا گھڑا ہے۔ اس کی نندیا اپنی چال چل گئی تھی۔

دریا میں بلا کا طوفان تھا، لہروں کے تلاطم میں موت منہ کھولے کھڑی تھی۔ سوہنی کا جی دھک سے ہو گیا۔

یہ اس کے امتحان کا وقت تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے رُکی اور مہینوال کا نام لے کر دریا میں کود پڑی۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ اسے اب کون کہے اور کون سُنے۔

انتظار کے صدمے کب تک سہے جا سکتے ہیں۔ مہینوال کچھ دیر تک سوہنی کی راہ دیکھتا رہا۔ آخر کار جس آواز کو اس کے کان نہ سُن سکے تھے۔ اُس کے دل نے اُسے سُن لیا۔ وہ بھی بے دھڑک دریا میں کود پڑا اور پھر دنیا اُس کی صورت نہ دیکھ سکی۔

یہ ہے سوہنی مہینوال کی سادہ مختصر سی کہانی، اور یوں محبت کی کہانی ہوتی بھی کیا ہے۔ ؏

"از نگاہِ شوق حرفے بیش نیست"

سوہنی مہینوال کا قصہ اگرچہ دوسرے قصوں سے قدرے مختلف اور قدرے حقائق کے قریب تر ہے۔ لیکن اس میں بھی ہیرو اور ہیروئن یا عاشق معشوق دونوں کی پیدائش اور موت غیر معمولی واقع ہوئی ہے۔ پنجاب کی دیہاتی معاشرت اور اُس کی اقدار کے مطابق

مہینوال ایک خوبصورت، ہنرمند نوجوان ہے جو اپنی محبوبہ کے لئے دھن دولت، عزت، آبرو، جان سب کچھ قربان کرسکتا ہے۔ سوہنی ایک حسین دوشیزہ ہے جو ازل سے اپنے عاشق کیلئے مقدر ہو چکی ہے۔ اب وہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ غیر سے شادی ہونے پر بھی غیر اُسے نہیں چھو سکتا۔ سوہنی کی دعا شوہر کو اس سے بیگانہ بنادیتی ہے تاکہ اس کی عصمت مہینوال کے لئے محفوظ رہے۔

ان پاکیزہ تصوراتِ عشق کے باوجود قبیلے، جماعت اور برادری کا امتیاز بھی قائم ہے۔ سوہنی کے ماں باپ سوہنی مہینوال کے ملاپ کو برداشت نہیں کرسکتے۔ تندیا کی غیرت اسے گوارا نہیں کرتی۔ اس عصبیت کے ساتھ ساتھ مذہبی عقائد کا تقدس اور رسم و رواج کی اہمیت کو نظرانداز نہیں جاسکتا۔ غیر مرد اور غیر عورت کا خود بخود یوں گھل مل جانا ٹھیک نہیں۔

اُدھر عشق و محبت کا تقدس بھی قائم ہے، مگر اس کے ڈانڈے روحانی عشق سے جا ملتے ہیں۔ سوہنی مہینوال کا وصال ضروری ہے۔ مگر اس دنیا میں نہیں، آخرت میں۔ اور پھر اس دنیا میں اُن کی جدائی بھی گوارا نہیں کی جاسکتی کیونکہ جدائی دردناک چیز ہے۔ اس لئے کوئی خدا رسیدہ انسان ان مظلوموں کی آہ و فریاد بھی سنتا ہے۔ اور آڑے وقت میں کام آتا ہے۔ وہ اُن کی جان کا رکھوالا ہے۔ مگر اُن کی زندگی موت کے سوا پروان نہیں چڑھ سکتی۔

یوسف زلیخا

(سوال وجواب)

مولوی غلام رسول

مترجمہ: شہاب رفعت

آج ہے کیسا حال زلیخا؟ یوسفؑ نے فرمایا
کہے زلیخا جو کہ بظاہر یوسف تو نے پایا
یوسف پوچھے کہو زلیخا، کیوں کر وقت کھلایا؟
کہے زلیخا جیسے جیسے میں نے تجھے بتایا
یوسف پوچھے کہو زلیخا کہاں گیا وہ جوبن؟
کہے زلیخا عشق میں تیرے کر دیا قرباں تن من
یوسف پوچھے کہو زلیخا کہاں گئیں وہ زلفیں؟
کہے زلیخا درد سے تیرے جھڑ کے گریں گلیوں میں
یوسف پوچھے کہو زلیخا اور لڑی دانتوں کی؟
کہے زلیخا تری ہی مالا جپتے گھس کر ٹوٹی؟
یوسف پوچھے کہو زلیخا اور وہ قاتل آنکھیں؟
کہے زلیخا بہہ گئیں ہو کر خون تری فرقت میں
یوسف پوچھے کہو زلیخا کیوں چھوڑیں وہ گھاتیں؟
کہے زلیخا عشق میں دل کو ہو گئیں سو سو ماتیں

یوسف پوچھے کہو زلیخا اور وہ شان تمہاری ؟
کہے زلیخا چار ہی دن وہ رہ کر دور سدھاری
یوسف پوچھے کہو زلیخا ہوش سدھارے کیونکر ؟
کہے زلیخا کتنے پتھر آن کے ٹوٹے اُن پر
یوسف پوچھے کہو زلیخا کیوں نہیں نور جبیں پر ؟
کہے زلیخا چاند نہ چمکے صبح ہوئی جب سر پر
یوسف پوچھے کہو زلیخا نین ترے کیوں روئیں ؟
کہے زلیخا میرے رخ سے گرد دکھوں کی دھوئیں
یوسف پوچھے کیسے زلیخا کھوئے مال خزانے ؟
کہے زلیخا نام پہ تیرے لوٹ لیا دنیا نے
یوسف پوچھے اجڑی زلیخا کیونکہ عمارت عالی ؟
کہے زلیخا ہو گئی خاک اب خود ہی عمارت والی
یوسف پوچھے کہو زلیخا کہاں ہے فرش حریری ؟
کہے زلیخا ہجر پلنگ اور فرش مرا دلگیری
یوسف پوچھے کہو زلیخا کہاں ہیں زیور تیرے
کہے زلیخا نام نہ ان کا لے تو سامنے میرے
یوسف پوچھے کہو زلیخا کہاں ہے تخت سنہری ؟
کہے زلیخا لے گئے لوٹ کے نام پہ تیرے شہری
یوسف پوچھے کہو زلیخا ، کہاں ہے دایہ مائی ؟
کہے زلیخا در در سے تیرے دیتی پھرے دُہائی
یوسف پوچھے کہو زلیخا آج کہاں سرداری ؟
کہے زلیخا درد نے تیرے لوٹ لی مایا ساری

یوسف پوچھے کہو زلیخا مجھ پہ ستم کیوں ڈھایا؟
کہے زلیخا جو بھی کہا تھا سامنے میرے آیا
یوسف پوچھے کہو زلیخا کیا مشکل پیش آئی؟
کہے زلیخا عشق نے تیرے من میں آگ لگائی
یوسف پوچھے کہو زلیخا کیوں کر یہ دن بیتے؟
کہے زلیخا دم دم یوسف زہر کے پیالے پیتے
یوسف پوچھے کہو زلیخا چین پھر آیا کیسے؟
کہے زلیخا میرے دکھ پر سکھ کو قرباں کر کے
یوسف پوچھے کہو زلیخا کیونکر عمر گذاری؟
کہے زلیخا روئے بنا اک گھڑی نہ گذری واری!

میندھرا مومل

خاور جسکانی

... روہی کے اس بے آب گیاہ چٹیل میدان میں جہاں ریت کے بھورے بھورے ٹیلوں کے غیر مختتم سلسلوں میں نگاہیں اپنا راستہ بھول جاتی ہیں اور چاروں طرف چھوٹی چھوٹی خودرو جھاڑیاں ریتیلے ٹیلوں کے بیچوں بیچ سر نکالے جھانکتی رہتی ہیں اور جن کے وجود سے ٹیلوں کی بنجر یکسانی میں کوئی فرق نہیں آتا ..... دو قد آور ٹیلوں کے درمیان آج بھی ایک کہن سال خشک درخت کا وجود باقی ہے جس کی دو بڑی بڑی شاخیں سالہا سال سے آندھیوں اور طوفانوں کے تھپیڑے کھا کھا کر پیچھے کی طرف مڑ گئی ہیں!

دیکھنے والوں کو یہ درخت ایک "محوِ انتظار عاشق" سے مشابہ نظر آتا ہے جو مدتوں کی یاس اور نا امیدی کے باوجود زندہ ہو اور سالہا سال سے فضا میں پھیلی ہوئی اس کی ویران باہوں کو محبوب کے لوٹ آنے کی امید باقی ہو جسے یہ ترستی ہوئی باہیں آغوش میں لے لیں

پربت دھاراں، دوہ گھنیرے
بیشک دردمنداں دے دیرے

ہووے یار دِملم آ یاراں

واٹ نہاراں، کانگ اُڈاراں

آوسی میڈا یار کڈاھیں

گُل لاون کوں بھتکن باھیں

گھنیرے پہاڑوں کی سکون بخش آغوش میں دردمندوں کا ٹھکانہ ہے! کاش! کبھی ایسا ہو کہ بچھڑا ہوا دوست ان راستوں پر آملے، جن راستوں پر منتظر نگاہیں اسے ہمیشہ ڈھونڈتی ہیں ـــــ اسی خیال میں ـــــ اسی امید پر،
کہ کبھی تو وہ آئے گا، جسے گلے لگانے کے لئے باہیں تڑپتی ہیں!)

یا جیسے یہ عاشق لمبی ویران راہوں پر اپنی پتھرائی ہوئی نظریں جمائے کسی ریگستانی قافلے کا منتظر ہے، جو اس کے محبوب کے دیس سے لوٹتا ہوا گذرے اور اور اسے اس کا کوئی پیغام دے کر دوبارہ زندگی کی نوید بخشے، یا پھر کوئی خبر دے کر اس کے انتظار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دے۔ لیکن اس کا یہ انتظار شاید ابدی ہے!

گیادول دا ول وچ دولا دا وے

نا یار ملدا، نا موت آوے

گرد و غبار، ریت اور دھول کے اَن گنت کارواں ان پر سے سنسناتے ہوئے گذر جاتے ہیں اور کبھی کوئی بھولا بھٹکا بادل اس کی نامرادی پر دو آنسو بہاتا ہوا گذر جاتا ہے مگر اس کے مسلسل انتظار میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا! ـــــ وہ ریت کے اس بے کراں سمندر میں ایک ابھری ہوئی چٹان کی مانند کھڑا ہے!

یہی وہ درخت ہے جو مینڈھرا اور موَمل کی سچی داستانِ عشق کا امین ہے۔ یہ دونوں محبوب اسی درخت کے نیچے مدفون ہیں، جن کی محبت پر موت بھی غلبہ نہ پا سکی ـــــ وہ آج بھی زندہ ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے!

یہ سنہری ریت جس کے نیچے محبت کا ایک انمول خزانہ مدفون ہے آج بھی اہل محبت کی آنکھوں کا سرمہ بنتی ہے اور دنیا والے آج بھی اس "بارگاہِ عشق" سے محبت کی بھیک مانگنے آیا کرتے ہیں!

اور آج اسی مقدس بارگاہ پہ زیناںؔ اور شہلؔ اپنی محبت کی پاکیزگی اور وفا کی سوگند اٹھانے آئے ہیں!

پس منظر...... کلانور کی بستی، چند فرلانگ کے فاصلے پر۔

ماحول...... سکوتِ شب۔ بکھری ہوئی چاندنی

——— دوبارہ بندوق چلنے کی آواز سے رات کے خاموش ایوان گونج اٹھتے ہیں۔ شہلؔ اپنی آمد کا یہ پیغام دے کر ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھا ہوا اپنی محبوبہ کی راہ تک رہا ہے اور اس کی بے تاب نگاہیں سامنے کی پگڈنڈی کے خم و پیچ میں زیناںؔ کا نشان ڈھونڈ رہی ہیں۔

"عشق کی پکار" حسن کے کانوں تک پہنچ گئی ہے اور محوِ راحت لوگوں کے درمیان ایک محبت زدہ بیدار دل اپنے محبوب کے پاس پہنچنے کے لئے راہیں ڈھونڈھ رہا ہے لیکن چاندنی اس کے راستے میں "موجیں مارتے ہوئے دریا کی" مانند حائل ہے جسے اس نے اس سمے حیلے بہانے "کچے گھڑے" بغیر عبور کرنا ہے...... چاند اسے اس کے "چاند" کے دیدار سے محروم کرنے پر تل گیا ہے لیکن اس کے قدم آگے ہی آگے جا رہے ہیں —

اور آخر کار شہلؔ کی منتظر نگاہوں کو چاندنی اور سایوں میں محبوب کا نشان نظر آ گیا ہے۔ زیناںؔ نے اپنا شب رنگ آنچل فضا میں لہرایا ہے، جیسے اس نے چاند کی ناکامی کا مذاق اڑایا ہو اور چاند نے اس لمحے ایک آوارہ بادل کی اوٹ میں اپنا منہ چھپا لیا ہے!

ایک شیریں آواز چاندنی میں گھل مل گئی ہے!

"شہلؔ! مجھے ڈر تھا کہیں تم لوٹ ہی نہ جاؤ۔ مجھے آنے میں دیر ہو گئی، یہ چاند بار بار میری چغلی کھاتا تھا!"

اس کے جواب میں دو سائے ایک دوسرے کے بالکل قریب آگئے اور چاند نے دیکھا کہ ایک سایہ دوسرے میں کھو گیا ہے!

"انتظار کی وہ رات جس میں امید کا چراغ جلتا ہو۔ انتظار کے لمحوں کو حسین تر بنا دیتی ہے، زیناں! یہ دیکھو کریر کا درخت جس کے نیچے نہ جانے کتنا عرصہ مینڈھرا نے موَمل کا انتظار کیا تھا..."

"یہی سائیں مینڈھرا؟"

"ہاں! یہ سائیں مینڈھرا جواب اپنی موَمل کے ساتھ اس درخت کے نیچے دفن ہے، موَمل کا انتظار کرتے کرتے آدھا ریت میں دھنس گیا تھا۔ مگر پھر بھی موَمل نہ آئی تھی۔ میرے لئے یہ چند گھڑیوں کا انتظار کون سی بڑی بات ہے اور پھر جب یہ بھی معلوم تھا کہ تم ضرور آؤ گی"!

"لیکن شہل، موَمل پھر کیسے سائیں مینڈھرا سے آملی؟"

"یہ داستان بڑی عجیب ہے، آؤ تمہیں آج سناؤں"۔

چاند جاگ رہا تھا۔ بستی کے چرواہے سو رہے تھے، دنیا کی نظروں سے دور محبت کی یہ خلوت گاہ دیر تک آباد رہی، دو دھڑکتے ہوئے دل پاس پاس تھے۔ شہل کی زبانی جدائی اور ملاپ کی یہ عجیب داستان زیناں اور چاند نے یوں سنی!

"...... کلانور کی اس بستی کی جگہ پر آج سے مدتوں پہلے ایک بہت بڑا قصبہ وَھٹ آباد تھا۔ وَھٹ میں موَمل کا باپ چنور سردار رہا کرتا تھا۔ وہ سامنے اس تیسرے ٹیلے کے پاس ایک کنواں تھا۔ جہاں موَمل اپنی ہمجولیوں کے ساتھ پانی بھرنے آیا کرتی تھی۔ ایک دن جیسلمیر کا ایک چوڑے کا سوداگر، مینڈھرا وَھٹ میں آٹھیرا۔ جیسلمیر کا چوڑا بہت مشہور ہوتا تھا۔ چنانچہ مینڈھرا کا لایا ہوا چوڑا چنور سردار کے گھر میں بھی پہنچا اور وہیں مینڈھرا کی نگاہیں موَمل سے چار ہوئیں اور وہ موَمل کو اپنا دل دے بیٹھا۔ اس پر اس نے اپنا تمام مال وَھٹ میں بیچ دیا اور

وہیں رہ پڑا۔ وہ روزانہ مومل کو کنوئیں پر آتا دیکھتا۔ ایک دن جب مومل اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کنوئیں پر تھی تو بیندھرا فقیروں کے بھیس میں وہاں آیا اور پینے کے لئے پانی مانگا، پیاسے کو پانی پلانے میں ہر ایک نے پہل کرنے کی کوشش کی، مگر مینِدھرا نے جلدی سے مومل کے آگے چلو جوڑ دیا۔ مینِدھرا کے ہاتھوں پر پانی پڑتے ہی عشق کی آگ جو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی ہاتھوں سے دھواں بن کر اٹھنے لگی...... اور اسی حالت میں دونوں کی نگاہیں بیک وقت اٹھیں، ملیں اور جھک گئیں۔ پانی ختم ہو چکا تھا عشق کی آگ دونوں دلوں میں بھڑک اٹھی تھی!

اس کے بعد نازوں میں پلی مومل کی خلوتیں چوڑے کے لئے ہوئے سوداگر کے خیالوں سے آباد رہنے لگیں، محبت دونوں طرف سے خاموش تھی اور سلسلۂ ملاقات اسی طرح کہ مومل کنوئیں پر جاتی اور مینِدھرا کی نگاہیں "نقشِ کفِ پائے یار" پر بوسے دیتے ہوئے اس کے تعاقب میں جاتیں، کنوئیں سے واپسی مینِدھرا تھوڑے فاصلے پر اس کے پیچھے پیچھے چلتا اور کبھی کبھی اسے ان زندگی بخش نگاہوں کی خیرات مل جاتی اور اسی پر اس کی محبت کا گذر تھا! اور یوں گذر کرتے دن گذر گئے تھے!

انہی دنوں میں ایک دن چڑھا!

اور طلوعِ آفتاب دونوں کے لئے جدائی کا پیغام لیکر آیا چنور سرداری نے وحدت سے سفر اختیار کر کے شہر لودرو کی طرف رخ کرنے کا ارادہ کیا۔

اس دن جب گاؤں کی دوشیزائیں بکریوں کو اور مومل کی نظریں مینِدھرا کو سیراب کرنے لگیں تو کسی غیر معمولی بات کے آثار مینِدھرا کو نہ ملے۔ وہ حسبِ معمول اپنی محبوبہ کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا اور اپنی مخصوص جگہ پر جا کر رکنے سے پہلے مومل نے اپنا آنچل پیچھے کی طرف لہرا کر اسے آگے چلے آنے کا اشارہ کیا۔ مگر عشق نے حسن کے اشارے کو غلط سمجھا اور وہ وہیں رک گیا!

اس کے بعد کئی آفتاب مومل کا نشان دئے بغیر ابھرے اور بن محبوب کے

اس سونی بستی پر چمک کر ویران ٹیلوں کی اوٹ میں ڈوب گئے! ہوائیں چلیں مگر موّمل کی خوشبو کو جلو میں لئے بغیر آئیں، کنویں کے ہنگامے سرد پڑتے گئے، چنوڑ سردار کی دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی بستی چھوڑنا شروع کر دی۔ اور اس طرح وھٹ کا قصبہ مینڈھرا کے دل کی مانند ویران ہو گیا۔ مگر عشق نے حسن کے انجانے حکم سے سرتابی گوارا نہ کی۔ اور وہیں سراپا انتظار رہا!

ادھر وھٹ سے چلا ہوا قافلہ شہر لودرمیں جا پہنچا۔ چنوڑ سردار کے قبیلہ نے جندار کے سیمیں پانیوں کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں اپنی بستی بسائی مگر محبوب سے بچھڑ کر موّمل کی دنیا کو یہ مناظر سیراب نہ کر سکے اور وہ مرض عشق کا شکار ہوتی گئی۔ چنوڑ سردار کے لئے بیٹی کا یہ نامعلوم مرض پریشانی کا باعث تھا مگر وہ بے شمار حیلوں کے باوجود اسے اچھا نہ کر سکا!

موّمل کو اب تنہائی سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں تھی۔ مینڈھرا کا خیال اسے درختوں کے نیچے لئے لئے پھرتا۔ اور فراق زدہ دل کی پکار درد بھرا گیت بن جاتی:۔

پیرا ھوا ترااں، کھوج نہ پاواں

رودو کرڈ کنڈ اگل لاواں

نین سیکتے زار وزار

تھی راھی تھل مارو جلساں

لانڈی تے لس بیلہ رُلساں

گل وچہ پائم پریت مُھار!

ماری ماری پھرتی ہوں، پاؤں جل جاتے ہیں مگر محبوب کا نشان نہیں ملتا۔ درد کی ماری۔ رو رو کر کنڈے اور کریڑ کے درختوں کو گلے لگاتی ہوں! اجڑے نین زار زار بہتے ہیں! میں تھل اور مارڑ کی طرف سفر کروں گی، لانڈھی اور لس بیلہ کی خاک چھانوں گی۔ مصیبتوں کی کیا پرواہ جب میں نے محبت کی مہار گلے میں ڈال لی ہے!)

موملؔ کی پکار جنگل جنگل اٹھتی مگر کہیں سے اسے جواب نہ ملتا، وہ جنداری لہروں کو، ماڑ کی طرف جانے والی ہواؤں کو، درختوں سے ڈار ڈار اڑتے ہوئے پرندوں کو اپنا پیغامبر بناتی کہ وہ مینڈھرا کے کانوں تک اس کا پیغام پہنچا دیں اور اسے شہر لودر کا پتہ دیں!

آمل مار و مینڈھرا — تھل وچہ کردیاں دھاھاں
ماراں ھکلاں کوکڑیاں — کرکر لنبڑ یاں باھاں
بھل گیاں رسماں ریتڑیاں — جیں ڈینہہ لگڑیاں پیتاں
ما، پیو، ویر، وسارئیم — لبس ھِک تیکوں چاھاں

(آ! ظالم مینڈھرا، آکر مل جا کہ تیری یاد میں میری چیخ و پکار تھل میں گونج اٹھتی ہے! میں باہیں پھیلا پھیلا کر اپنی گھائل آواز سے تجھے پکارتی ہوں، اور جس دن سے تیری محبت کو گلے سے لگایا ہے۔ محبت کے سوا باقی ہر ریت اور رسم بھول گئی ہے، یہاں تک کہ ماں، باپ اور بھائی کی محبت بھی بھول گئی۔ ایک تیری ہی محبت کا چراغ سینے میں جلتا ہے!)

اسی اثنا میں بہار کا موسم آگیا۔ وادی وصحرا سبز پوش ہو گئے اور چپہ چپہ پھولوں کی رنگینی سے بھر گیا۔ لیکن محبوب کے بغیر آئے تو بہار قاتل بن کے آتی ہے۔ مومل کو پھول کے ہر پتے میں اپنا ہی خونِ دل و جگر نظر آتا تھا اور وہ بہار کی رنگینیوں سے متاثر ہو کر درد بھری آواز میں پکار اٹھی تھی:۔

ڈیس سُھا سانول آج کل — ناتاں وسائیں مَرجَل گل
وھٹ میں وسدا مینڈھرا — شہر لودر دے مومل
سُرخی لہہ گئی، ویہہ گئے — دو دو سُرمے، کاجل!
سُک سر مارم سانگراں — تانگھاں تا دم، ول ول

(میرے سانولے محبوب! آج کل میرے دیس کو رونق دے! ورنہ فراق کی اس

آگ میں جل کر مر جاؤں گی!

ستم ہے کہ مینڈھرا وھٹ میں بستا ہے، اور موّمل شہر لودرہ میں! فراق کے آنسو، آنکھوں کے سرمے، کاجل اور چہرے کی سرخی کو بہا لے گئے ہیں۔ طرح طرح کی بے چینی اور پریشانی کا شکار رہوں، اور تیرا انتظار بار بار ستاتا ہے!)

لیکن موّمل کی یہ تمام آہ وزاری صحرا میں ہی گونج کر ختم ہو جاتی اور اس کا کوئی بھی پیغام سراپا انتظار مینڈھرا تک نہ پہنچ پاتا جو ابھی تک وھٹ کی اجڑی بستی میں کریر کے درخت کے نیچے محبوب کی آمد کا منتظر کھڑا تھا!

لیکن انتظار کے دن ہمیشہ نہیں رہتے!

چنانچہ قدرت کو ان سچے عاشقوں کی حالت پر رحم آگیا اور ان کی ملاقات کے سامان ظاہر ہونے لگے۔ انہی دنوں اس علاقے کے ریگزاروں کے خضر، خواجہ غلام فریدؒ کا اپنے قافلے سمیت وھٹ کی اجڑی بستی سے گذر ہوا۔ یہ اہل دل سیاح خدا کی سرزمین کے گوشے گوشے کی سیر کرتے ہوئے ادھر آنکلے اور خواجہ کی نظر ریت میں دھنسے ہوئے مینڈھرا پر پڑی۔ فوراً اپنے رفیقوں سے جدا ہو کر اس سراپا انتظار عاشق کی جانب آئے اور اس کی حالت دیکھی۔ پھر اس کے سینے پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس میں زندگی کے دبے ہوئے آثار نمایاں کئے اور اسے طاقتِ گویائی دی۔ اس پر مینڈھرا نے اپنے عشق کی داستان انہیں کہہ سنائی! ریگزاروں کے خضر نے مراقبہ کیا اور اس کی محبوبہ کا نشان پا لیا اور مینڈھرا کو محبوب سے ملنے کا پیغام دے کر قافلہ کو شہر لودرہ کی جانب بڑھنے کا حکم دیا۔

ادھر اہل دل کا یہ کارواں روانہ ہوا اور ادھر موّمل کی حالت میں انقلاب آنے لگا، اونٹوں کا ہر نیا قدم قافلے کو شہر لودرہ کے قریب تر کئے دے رہا تھا اور موّمل ایک انجانی مسرت کے زیر اثر جھوم جھوم اٹھتی تھی جیسے بہاروں نے اس کا گم گشتہ پھول اس کے دامن میں لا ڈالا ہو، جیسے قدرت نے

اس کی پکار سن لی ہو، جیسے کسی دل والے پرندے نے خضر کا روپ دھار کر بلند صرا کو اس کا پتہ بتا دیا ہو۔ وہ اپنی اس تبدیلی پر حیران سی تھی:۔

آج زیور پئے ٹھنڈے ہِن　　　ھتاں ڈیہم سہاگ دے آندے ہِن
بادِ شمالی لُرکے، لُرکے　　　بارش رم جھم بُرکے، بُرکے
اکھیاں پُھرکن، لُوں لُوں مُرکے　　　ٹھر گئے گوشے ھاندے ہِن!

(آج زیور نہ جانے کیوں سج رہے ہیں؟
شاید ملاپ کے سہانے دن ہی آ رہے ہیں۔
بادِ شمال کے فرحت بیز جھونکے، اور بارش کی رم جھم رگ رگ میں مسرت کی لہر دوڑا رہی ہے۔
آنکھیں پھڑکتی ہیں، رواں رواں لہرا اٹھتا ہے۔
ایک انجانی خوشی ہے جس سے دل کے گوشے گوشے میں ٹھنڈک پڑ گئی ہے!)

اسی حالت میں قافلہ شہر کوٹ میں وارد ہوا۔ اور "ریگزاروں کے خضر" نے چنوں سردار کے گھر کے سامنے درختوں کے سائے میں ڈیرے ڈال دئے! پیر کی آمد کی خبر سن کر لوگ دوڑے دوڑے آئے اور ان کے ساتھ چنوں سردار بھی حاضر ہوا اور خدمت بجا لانے کی اجازت چاہی۔ خواجہ صاحب نے اس کے حالات سے آگاہی پا کر اس کی اس دعوت کو قبول کر لیا۔ چنوں سردار نے اپنی مریض بیٹی کے حق میں دعا چاہی اور اسے ہی مہمانوں کی تواضع کے فرائض بجا لانے پر مقرر کیا!

موّمل کو پہلے ہی سے اپنے دل کی تبدیلی پر تعجب تھا۔ جب اس نے قافلے کی آمد کی خبر سنی تو اس کے دل کے تار یکدم جھنجھنا اٹھے اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا گم شدہ محبوب اسی قافلے کے ساتھ اس کے دیس میں آن پہنچا ہو!

وہ بصد مسرت مہمانوں کی تواضع کے لئے حاضر ہوئی اور ہاتھ دھلاتے وقت سب سے پہلے خضر صورت بزرگ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا مگر خواجہ

بزرگ نے ملیند ھرا کی طرف اشارہ کیا۔

پانی کے لئے ملیند ھرا کے ہاتھ جھک گئے، نگاہیں اوپر کو اٹھیں۔ اور پھر نہ جھک سکیں! دو بچھڑے ہوئے محبوبوں کے دیدار کا یہ منظر عجیب تھا! لبوں پر سکوت، دلوں میں طوفان، نگاہیں پیوست!

پانی ملیند ھرا کے ہاتھوں پر بہتا رہا اور پھر ان ہاتھوں سے وہی دھواں اٹھنے لگا جو دل میں بھڑکتی ہوئی آگ کا مظہر تھا۔ پانی بہتے بہتے ختم ہو گیا، آنکھیں دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں، اور لبوں پر چھایا ہوا سکوت، ابدی سکوت بن گیا! محبت بھری روحیں جسمانی قید سے آزاد ہو گئیں

چنور سردار کے غم و رنج اور حیرت و تعجب کی کوئی انتہا نہیں تھی اس کی یہ حالت دیکھ کر خواجہ بزرگ نے اسے تمام داستان کہہ سنائی اور حقیقت اس پر واضح کر دی۔ اور پھر اس کی اجازت سے دونوں کے پاکیزہ جسم وحشت کے ویران ریگزار میں لے آئے اور اسی درخت کے نیچے انہیں دفن کر دیا! مگر یہ نہ سمجھو کہ وہ اب مر چکے ہیں۔ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے چرواہوں نے انہیں کئی بار بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کرتے اور گلوں کی نگہبانی کرتے دیکھا ہے۔" یہ کہہ کر شہل نے داستان ختم کر دی!

زیناں اور چاند دونوں اس داستان سے مسحور تھے۔ زیناں نے عقیدت بھری نگاہوں سے ٹیلے کی طرف دیکھا اور ٹیلے کی ریت آنکھوں پر مل لی چاند انسانوں کی اس داستان پر حیران تھا۔ اسے ان کی زندگی پر رشک آنے لگا۔ کہ وہ محبت کا ایک داغ دل پر لے کر سورج اور چاند کی چمک کو مات کر دیتے ہیں۔ چاند کے دیکھتے دیکھتے دو تھرکتے سائے ایک دوسرے کے قریب آئے، ملے اور دوبارہ ملنے کے لئے پھر جدا ہو گئے! ٭

سمّی

نُور اخگر تونسوی

دریائے سندھ کے اُس پار، دریائے سنگھڑ کے کنارے آباد سرزمین تونسہ نے جانے کتنے انقلابات زمانہ دیکھے ہیں اور کتنے ہی انقلابات سے آج بھی دوچار ہے۔ یہاں عہد ماضی میں نہ جانے کتنے حوادثات و واقعات نے جنم لیا اور کتنے ہی ابھی کتمِ عدم میں پڑے ہیں اور اس ریتیلی زمین کا ہر ایک ذرہ اپنی پرانی تاریخ کا آئینہ دار ہے اور زبان حال سے پکار پکار کر ان پرانے واقعات کو کھول کھول کر بیان کر رہا ہے جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ عہد ماضی کے کتنے ہی لوگوں نے ان واقعات کو سنا سمجھا اور لوح دل پر کندہ کر لیا۔ یہی واقعات پھر سینہ بسینہ منتقل ہوتے ہوتے اس دور تک بھی پہنچ گئے ہیں آجکل بھی کہیں کہیں ان کو کسی کی زبان سے سنا جا سکتا ہے۔ یہ واقعات ہماری پرانی تہذیب اور ثقافت سے متعلق ہیں۔

اگر ان عوامی روایات کو ہم نے اب جمع نہ کیا تو امتداد زمانہ کے ہاتھوں وہ فنا ہو جائیں گے۔ اسی جذبے سے متاثر ہو کر مغربی پاکستان کی قدیم تاریخی سرزمین، تونسہ، کی ایک ثقافتی جھلک یہاں پیش کی جاتی ہے۔

جب تونسہ کی ریتیلی زمین سورج کی کرنوں کو اپنے اندر جذب کرنے کے بعد دوزخ کے گرم ترین طبقے کی طرح گرم ہو جاتی ہے۔ جب یہاں کی گرم لُو کے جھکڑ چلتے ہیں اور یوم الحساب کی "العطش" کو یاد دلاتے ہیں۔ جب یہاں کے غریب و نادار کسانوں اور کاشتکاروں کی کھیتیاں مرجھانے اور کھلانے

لگتی ہیں تو ہر آنکھ بے بسی کے عالم میں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہے۔ اس وقت ہر انسان کا سر مالک حقیقی کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے کہ وہی بندوں پر اپنی رحمت ارزانی کرے گا اور یہ تونسہ (پیاس اور شدت گرما) دور ہو گی۔ باران رحمت کی ایک جھال گرے گی اور روحیں تازہ ہو جائیں گی۔

سورج اس ریتیلی زمین کو آگ کے گولے کی طرح گرم کر کے خود پہاڑیوں کی اوٹ میں چھپ جاتا ہے تو لُو کے جھکڑ اپنی خفیف سی سردی کے ساتھ ریت کو ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے زمین ٹھنڈی ہونے لگتی ہے ...... اب چاند اپنی پوری کرنوں اور روشنی کے ساتھ آسمان پر جلوہ گر ہوتا ہے اور تونسہ کی وہ زمین جو تھوڑی دیر پہلے سورج کی گرم کرنوں کی زد میں تھی، چاند کی ٹھنڈی اور صحت بخش کرنوں سے ڈھک جاتی ہے۔ وہ زمین جو سورج کی گرمی سے بالکل مردہ ہو چکی تھی اب زندہ ہونے لگتی ہے ...... اس وقت تونسہ کی نواحی بستیوں میں نوجوان لڑکیاں مختلف گروہوں میں اکٹھی ہو کر بڑی بوڑھیوں کی زیر ہدایت ایک دیہاتی لوک گیت گاتی ہیں، جسے "سمی" کہا جاتا ہے۔ اس دیہاتی علاقہ میں یہ اعتقاد پایا جاتا ہے کہ "سمی" کہنے سے رحمت خداوندی جوش میں آجاتی ہے اور اتنی بارش ہوتی ہے کہ اس علاقہ کی ریتیلی اور پیاسی زمین جل تھل ہو جاتی ہے۔ پہاڑی نالے جوش میں آجاتے ہیں اور اس زمین پر جہاں پانی کا نام ونشان تک نہیں ملتا، پانی کی ایک موٹی تہہ پھیل جاتی ہے، نادار اور غریب کاشتکاروں اور کسانوں کی کھیتیاں سرسبز ہونے لگتی ہیں اور تمام زمین پر زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔

"سمی" ایک لوک گیت ہی نہیں بلکہ ایک برساتی نغمہ بھی ہے۔ فی الحقیقت وہ ایک گیت نہیں بلکہ پورا واقعہ ہے جو تونسہ کی سرزمین پر ہوا، ہزاروں دوسرے انسانی واقعات کے ساتھ یہ گیت ایک دکھیا ماں کی فریاد ہے جو اس نے اپنی لڑکی کی یاد میں خون کے آنسو رو رو کر اپنے خون دل سے لکھی۔ پھر یہ واقعہ مشہور ہوتے ہوتے ایک گیت کی صورت میں بکھر گیا اور تونسہ کے نواحی علاقہ میں آجکل بھی اتنا ہی مشہور ہے جتنا کسی اگلے سمے میں تھا۔

حضرت خواجہ سلیمانؒ کے تونسہ میں تشریف لانے سے پہلے (یعنی ۱۷۸۵ء سے پہلے) تونسہ

ایک معمولی سا قصبہ تھا۔ اس جگہ پر جہاں آجکل تونسہ کا وسیع اور عریض قصبہ پھیلا ہوا ہے ریت کے ان گنت ٹیلوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ (آجکل بھی یہ ٹیلے تونسہ کے نواحی علاقہ میں پھیلے ہوئے ہیں) اس وقت یہاں دو تین بلوچ قبیلے آباد تھے۔ ان کی ضرورتیں پورا کرنے کے لئے دو تین گھرانے قصباتی کاریگروں یعنی موچیوں، کمہاروں اور بڑھیوں کے بھی موجود تھے۔ انہی گھرانوں میں سے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں ایک اندھی عورت رہتی تھی جو بیوہ بھی تھی۔ اس کی زندگی کا سہارا صرف ایک لڑکی تھی جس کا نام "سمی" تھا۔ وہ بے چاری عورت امیر گھرانوں میں نوکری کر کے اپنا اور اپنی لڑکی کا پیٹ پالتی تھی وہ خود تکلیف اٹھاتی تھی لیکن "سمی" کو تکلیف نہیں پہنچنے دیتی تھی اس طرح اچھے یا برے زندگی کے دن کٹ رہے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لڑکی بھی جوان ہو گئی۔ اب اس بیوہ کو داماد ڈھونڈنے کا اہم اور نازک مسئلہ درپیش تھا۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن اپنی منشا کے مطابق نیک اور اچھا رشتہ "سمی" کے لئے نہ مل سکا۔ جس طرح آجکل اچھے برے سب طرح کے سب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی ایسے ہی لوگ تھے۔ ان دنوں وہاں ایک بداخلاق آدمی تھا۔ اس نے ایک دن موقع پا کر اس بیوہ کو دھوکہ دے کر اس کی لڑکی کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور اسے لے جا کر ایسا روپوش ہوا کہ پھر اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

ایک تو بے چاری غریب تھی۔ اور پھر ماتا کی ماری! اس لئے وہ سوائے رونے دھونے کے اس وقت اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس غم نے اس کے دل پر اتنا اثر کیا کہ اس کے منہ سے جو آہ نکلتی شعر بن جاتی۔ چنانچہ ان اشعار کو جو دراصل فراق کے گیت ہیں اس لڑکی کے نام پر "سمی" کہا جانے لگا۔

جب ۱۷۸۵ء میں حضرت خواجہ سلیمان رح سرزمین تونسہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے تو اس وقت "سمی" کے یہ گیت کافی مشہور ہو چکے تھے جب بھی لوگ بارش نہ ہونے کی شکایت کرتے تھے تو حضرت خواجہ سلیمان رح انہیں "سمی" گانے کی ہدایت کیا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ ایک دکھی دل کی فریاد تھی۔ "سمی" اتنا دردناک گیت ہے کہ اس کے گانے سے رحمت الٰہی بھی

جوش میں آجاتی تھی اور سرزمین تونسہ بارش کی رحمت سے جل تھل ہو جایا کرتی تھی۔
یوں تو سمیاں بہت ہیں مگر ذیل میں سمی کی قسم کا ایک گیت جو چند بندوں کی صورت میں ہے پیش کرتا ہوں:

اُچا کنگر سست مو ڑیاں نی مچاڑیاں سُمڑیاں وانڈ
کئی تاں ویلا رات ڑامبڈ ا' ایا شیرین لعل
شیرن دی نگیںڈی جڑ بیٹھی گوڈے نال
سمی اللہ وسائی گھر آ

(اے مرغ زور سے "سمی" کو آواز دے جو ایک موچی کی لڑکی ہے۔ اسے بتا کہ شیرن (سمی کا ہونے والا خاوند) بھی کل رات کو گھر آگیا ہے۔ شیرن کی ہونے والی بیوی بھی اس کے پاس آکر بیٹھ جائے۔ اے سمی تجھے اللہ اپنے گھر لے آئے!)

سمی جڑی کچاوڑے مچانڈئی سنخڑئی وانڈ
پچھو روندی ما گھرل گھتاں کچاوے کوں
میڈی صاحب صوبی ما۔

(سمی کو کجاوہ پہ لاد کر لئے جا رہے ہیں اور اس کی ماں اس کے پیچھے رو رہی ہے، خدا کرے وہ کجاوہ ٹوٹ جائے جس کے پیچھے میری ماں اپنی جان ہلکان کر رہی ہے۔)

کندھی تے بروٹڈ امچانڈئی سنخڑین لے وانڈ
جھل مرے بروٹڈا جھل ساتھی تیڈے کڈ گئے
ڈونیندڑاں ڈیکھ نہ بھل۔

(دریائے سنگھڑ کے کنارے ایک بوٹا کھڑا ہوا ہوا سے ہل رہا ہے۔ اے بوٹے تیرے ساتھ کھیلنے والی سمی تو چلی گئی ہے تو نہ جانے کیوں بے پروا کھڑا ہے۔)

آج کل بھی جب بارش نہیں ہوتی تو عورتیں "سمی" گاتی ہیں۔ اُس وقت ایک درد انگیز سماں بندھ جاتا ہے۔ بارش ہو یا نہ ہو لیکن ہر آنکھ ساون بھادوں کے بادل کی طرح

ضرور برسنے لگتی ہے۔ اب اگرچہ "سمّی" کی اہمیت ایک برساتی گیت کی نہیں رہی لیکن ایک لوک گیت کی سی اہمیت اسے اب بھی حاصل ہے۔ اسے سُن کر ہر اُس شخص کی جو اُس کے پس منظر کو جانتا ہو راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے اور بہت دنوں تک اس گیت کی دردناک باتیں دل میں ہلچل پیدا کئے رہتی ہیں۔ وقت بڑی تیزی کے ساتھ گذرتا جاتا ہے۔ کیا جانیں ہمارے لوک گیت جو ضائع ہو گئے ان ہی کی طرح یہ گیت بھی ختم نہ ہو جائے اور صرف اس کی یاد دلوں میں باقی رہ جائے کیونکہ لوگ اب اور ہی طرح کی موسیقی اور گیت پسند کرنے لگے ہیں۔

وادئ مہران:

سسّی پنّوں

مومل رانو

عمر ماروی

لیلاں چنیسر

نوری جام تماچی

مورڑو میر بحر

بھٹائی گھوٹ

سسّی پنّوں

شیخ ایاز

دریا کی شفاف سطح پر شفق کا عکس لرز رہا تھا۔ افسردہ اور اُداس شام کے سائے چاروں سمت پھیلتے نظر آ رہے تھے۔ اور فضا پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یکایک کسی چیز کے دھم سے گرنے کی آواز آئی۔ دریا میں چند لہریں نمودار ہوئیں۔ اور دور دور تک پھیل گئیں۔ کنارے پر ایک خوب صورت عورت اور ایک چوڑے چکلے کاندھوں والا مرد کھڑا تھا۔ عورت کی آنکھوں سے اداسی ٹپکتی تھی۔ اس نے بڑی مغموم نظروں سے صندوق کی طرف دیکھا جو شفاف پانی پر بہا جا رہا تھا۔ مرد کی آنکھوں میں عزم و استقلال کے ساتھ نفرت بھی جھلک رہی تھی۔ اُس نے صندوق کی جانب سے منہ پھیر لیا۔ یہ مرد نابینا برہمن تھا اور یہ عورت اُس کی بیوی تھی۔

اس واقعہ کو صدیاں گزر گئیں۔ لیکن سندھیوں کے دل میں یہ اُسی طرح تازہ ہے۔ جیسے ابھی کل کی بات ہو۔

نابینا کے گھر میں جشن ہو رہا تھا۔ صحن میں شہنائیاں بج رہی تھیں۔ کیونکہ شادی کے چار سال بعد اس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ آنگن میں بیٹھے ہوئے جوتشی عود اور لوبان کی خوشبو سے لپٹی ہوئی فضا میں لڑکی کا جنم پتر بنا رہے تھے۔ دفعتاً ایک جوتشی چونک اٹھا۔ اور مہمانوں نے تعجب سے اُسے دیکھا۔

کیوں؟ کیا ہوا؟ انہوں نے سوال کیا۔ جوتشی کا منہ اتر گیا تھا۔ ہکلاتے ہوئے۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ "یہ لڑکی کسی مسلمان سے شادی کرے گی"۔ اور نابینا نے بچی کو صندوق میں ڈال کر سطح دریا پر رواں کر دیا۔ وہ رات گزر گئی اور صبح ہوئی۔ شبنم آلود ہوا میں خنکی بسی ہوئی تھی۔ دریا پر دھند لکا چھایا تھا۔ اور لہریں لپک لپک کر ساحل کو چھوتی تھیں۔ گھاٹ پر دھوبی جمع ہو چکے تھے۔ اور کپڑے دھونے کی آواز فضا کی خاموشی کو چیرتی جاتی تھی۔ اچانک ایک دھوبی چلّایا۔ "یا اللہ یہ کیا چیز ہے"۔ دوسرے دھوبی بھی اس کے قریب آئے۔ دھوبی نے ایک صندوق کو پکڑ رکھا تھا۔ جس میں سے کسی نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ سب لوگ حیران تھے۔ بے حد تعجب کے ساتھ سب نے مل کر صندوق اٹھایا اور اُسے اپنے چودھری، محمد دھوبی کے پاس لے گئے۔

محمد دھوبی کے پاس خدا کا دیا ہوا اور تو سب کچھ تھا۔ لیکن اولاد کی نعمت سے وہ بھی محروم تھا۔ اُس نے صندوق کا ڈھکنا اٹھایا تو اس میں ایک ہنستی ہوئی بچی نظر آئی۔ ایک چھوٹی سی گڑیا پڑی پڑی ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اُس نے بچی کو اٹھا کر سینے سے لگایا۔ اس کو خدا کا دیا ہوا عطیہ سمجھا اور اُس کا نام رکھا "سسّی" یعنی چاند۔

بھنبھور کے شہر میں سے جہاں محمد دھوبی رہتا تھا۔ ان گنت کارواں گزرتے رہتے تھے۔ ہر سالار کارواں مہمان نواز محمد دھوبی کے یہاں کچھ عرصے قیام کرتا تھا۔ اور جب یہ کارواں بھنبھور کی سرزمین چھوڑ کر نگر ٹھٹھے کی طرف گامزن ہوتے تھے۔ تو چاندنی راتوں میں جب کہ صحرائے سندھ سونے کی جلتی ہوئی کان دکھائی دیتا ہے وہ بھنبھور کے چاند کا ذکر ضرور کرتے تھے۔ جس امیر کارواں نے سسّی کو دیکھا تھا وہ بڑے لطف سے اُس کے متعلق باتیں کرتا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ سسّی اوس کے موتیوں سے لدا ہوا ایک صحرائی پھول ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ سسّی کی آنکھیں ایسے جھلملاتی ہیں، جیسے چاندنی میں ریت۔ اور کوئی صرف سسّی کہہ کر مسکراتا تھا۔

اور خاموش ہو جاتا تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ سسّی کے حُسن کا چرچا دیس دیس ہونے لگا۔

ایک رات محفل جمی ہوئی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے چراغوں کی جگمگاتی ہوئی لَو رُک رُک اٹھتی تھی۔ کیچ مکران کا شاہزادہ پنّوں مسند نشین تھا اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ اتنے میں کسی نے سسّی کا ذکر چھیڑا۔ ساری محفل چہک اٹھی۔ حسن و رومان کی باتیں ہونے لگیں۔ سسّی کے تصوّر سے جیسے شاہزادہ پنّوں کے چہرے کا رنگ نکھر گیا۔ مدّت سے اس کے خواب و خیال کی دنیا کسی کی آمد کی منتظر تھی۔ وہ محفل سے اٹھ کر ایوان میں ٹہلنے لگا۔ رات کے گہرے سناٹے میں پنّوں کا سینہ جذبات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنا وطن چھوڑے یا نہ چھوڑے، اپنے والدین سے اجازت لے یا اُن سے کچھ کہے سُنے بغیر چلا جائے۔ آخر اُس نے تہیّہ کر لیا کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو گا سسّی تک پہنچے گا۔

بھنبھور کے گھر گھر میں چرچا ہونے لگا کہ مکران سے ایک مشک و عبیر کا سوداگر جس کا نام پنّوں ہے اپنا قافلہ لے کر آیا ہے۔ خوشبو سے سارا شہر مہک اٹھا۔ سسّی جو خود ایک بہار آفریں پھول تھی۔ پنّوں کی منزل پر مشک خریدنے کے لئے آئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مشک و عبیر کی خوشبو میں بسے ہوئے پنّوں کا تصوّر لئے ہوئے وہ گھر واپس ہوئی۔ اور کوشش میں رہی کہ پنّوں کی دل آویز ہستی نے اس پر جو سحر کیا ہے۔ اس سے اثر پذیر نہ ہو۔ لیکن آخرکار سسّی سے نہ رہا گیا اور اس نے اپنی سکھی کو رُودادِ دل کہہ سنائی۔

سکھی نے محمد دھوبی سے اشاروں میں اس کا ذکر کیا۔ لیکن محمد نے کہا "میں اپنی لڑکی اپنی قوم سے باہر نہیں دوں گا"۔ سکھی نے جواب دیا۔ "پنّوں بھی تو دھوبی ہے"۔ محمد کو یقین نہیں آیا اور اُس نے کہا۔ "اگر دھوبی ہے تو ذرا یہ کپڑے دھو کر دکھائے"۔ اور پھر اُس نے کچھ موٹے کُھردرے کپڑے

اٹھاکر سکھی کو دیئے جن کو پنّوں نے دریا پر لے جاکر دھویا ــــ انہیں دھوتے ہوئے اس کے ہاتھ زخمی ہوئے، اور کپڑے تار تار ہو گئے۔ پنّوں دل گرفتہ ہو کر دریا کے کنارے بیٹھ گیا۔ سسّی کی سکھی نے اُسے آکر جھنجھوڑا اور تسلّی دے کر کہا کہ اگر وہ ہر کپڑے میں ایک ایک اشرفی ڈال کر مالکوں کو دے آئے تو وہ شکایت نہ کریں گے۔ پنّوں نے ایسا ہی کیا اور کوئی بھی اس نئے اناڑی دھوبی کی طرف سے نالاں نہ ہوا۔ اور محمد کو اطمینان ہو گیا کہ پنّوں بھی اس کے کسی ہم پیشہ خاندان سے ہے۔ اُس کے بعد اس نے سسّی کا نکاح پنّوں سے کر دیا۔

پنّوں کے دن رات سپنے کی طرح گزر رہے تھے۔ لیکن اب اُس کے رفیق اور احباب اس نئی جگہ سے تنگ آ گئے اور انھیں وطن کی یاد ستانے لگی۔ پنّوں گویا ایک خواب میں کھویا ہوا تھا۔ اور کوئی اسے جگانے کی کوشش کرتا تھا تو چونک کر وہ اسے ہٹا دیتا تھا۔ اور پھر اسی کیف زا نیند کی دل آویزیوں میں کھو جاتا تھا۔

پنّوں کے والد نے پیغام بھیجے۔ لیکن پنّوں اپنے ارادے پر جما رہا۔ اس نے بھنبھور کو اپنا دیس بنا لیا تھا۔ جب قاصد نے واپس جاکر بادشاہ کو ساری داستان سنائی تو وہ بہت مغموم ہوا اور اپنے تین لڑکوں، چنرے ہوتی اور لوتی کو حکم دیا کہ جیسے بنے وہ پنّوں کو لے کر واپس لوٹیں۔

پنّوں کے بھائی بھنبھور پہنچے۔ پنّوں نے ان کی آمد کی خوشی میں ایک جشن منعقد کیا۔ محفل رنگ پر آئی اور مغنّیہ نے ایک سندھی دوہا گانا شروع کیا۔

"ندیا سوکھ جانے کے بعد پنچھی اُڑ جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

"ہائے لیکن یہ لڑکے کیوں تالیاں بجا کر اس پنچھی کو اڑاتے ہیں۔"

اسے سُن کر ایک عجیب طرح کے کرب کے ساتھ پنّوں کے دل میں خیال آیا کہ وہ ایک پنچھی ہے جسے لڑکے تالیاں بجا کر اڑا رہے ہیں۔ اُس نے صراحی سے باقی ماندہ شراب جام میں انڈیلی۔ تو اُسے گہری نیند محسوس ہوئی اور کچھ دیر بعد وہ

وہیں سو گیا۔ محفل برخاست ہوئی۔ پنّوں کے بھائی چنرے نے سوتے ہوئے پنّوں کو اپنے ساتھ اونٹ پر سوار کیا اور اپنے بھائیوں کے ساتھ تیزی سے مکران کی طرف روانہ ہو گیا۔

صبح کو جب سسّی کی آنکھ کھلی تو پنّوں کو موجود نہ پاکر وہ بہت پریشان ہوئی۔ اور جب اسے علم ہوا کہ پنّوں کو اس کے بھائی مدہوش کر کے اپنے ساتھ لے گئے تو وہ دیوانی ہو گئی۔ اُس نے کہا:۔

"میرے سجن! مہار تھام لو، اونٹ کو روکو، اس کنیز کی چوکھٹ کو
اپنے پاؤں سے نوازو۔ اے میرے دوست میں نے تمہارے
بغیر ہر پل میں قیامت کا سماں دیکھا۔"

"اے کاش اس کے اونٹوں کو دھوپ نہ ستائے! اے کاش اسے راستے پر پیاس نہ لگے!" پھر دن ڈھلا اور شام کی تاریکی پھیلی، چوری چھپے سسّی گھر سے نکلی اور اس نے مکران کا رُخ کیا۔ ساری رات وہ ستاروں سے باتیں کرتی رہی اور پیدل چلتی رہی۔ ہیبت ناک صحرا اس کے چاروں سمت دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اور وہ اس میں سرگرداں تھی۔ رات بیت گئی۔ صبح ہوئی۔ لیکن وہ چلتی رہی۔

اس کے نازک پاؤں میں آبلے پڑ گئے۔ درختوں کے کانٹوں سے اس کا جسم زخمی ہو گیا اور کپڑے تار تار ہو گئے۔ وہ گوشت پوست سے بنی ہوئی سسّی نہیں تھی۔ وہ تو محض ایک واہمہ تھی۔ پنّوں کا ایک سیال تصوّر، وہ تپش و تشنگی، گرد و بار سے بے پروا ایک طرف کو بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ سارا دن وہ چلتی رہی۔ اور جب کُہرے نے زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، تو اس کو ایک جھونپڑا اور نظر آیا۔ قریب جا کر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بنوار باہر نکل آیا۔ سسّی کے تھکے ہوئے خاک آلود لیکن جگمگاتے ہوئے حُسن کو دیکھ کر بنوار کی نیت بدل گئی۔

سسّی نے اُس سے پوچھا "تم نے کہیں میرا پنّوں تو نہیں دیکھا؟" بنوار

کہنے لگا۔ "دنیا میں سیکڑوں پنّوں ہیں، تم ایک پنّوں کا کیا پوچھتی ہو"۔ سسّی نے جواب دیا۔ "پنّوں تو سیکڑوں ہوں گے، لیکن میرا پنّوں تو وہی ہے۔ جس نے میرے جی پر جادو کر دیا ہے"۔

پنوار کے تیوروں سے خوف زدہ ہو کر وہ واپس جانے لگی تو پنوار نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ سسّی چیخی۔ لیکن پھر بھی وہ باز نہ آیا۔ آخر کار سسّی نے زمین سے پناہ مانگی کہ "اے دھرتی ماں، مجھے اپنے دامن میں چھپا لے۔" اُس کی فریاد سن کر زمین شق ہو گئی اور اُسے اپنے دامن میں چھپا کر پھر یکساں ہو گئی۔

پنّوں کو جب ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ اپنے بھائی کے ساتھ اونٹ کے جھکولے کھاتا چلا جا رہا ہے۔ پریشان ہو کر اس نے چنرے سے پوچھا "ہم کہاں جا رہے ہیں"۔ جب چنرے نے اسے ساری حقیقت سنائی تو وہ دیوانہ سا ہو گیا اور اونٹ سے چھلانگ لگا کر اُترا اور ایک طرف کو دوڑنے لگا۔ اُسے پتہ نہیں تھا کہ یہ راہ کہاں جا رہی ہے۔ وہ سسّی سسّی پکارتا جا رہا تھا۔ پتھر، پہاڑ، درخت جنگل، سب ایک ہو کر بازگشت میں جواب دے رہے تھے ...... سسّی!

اچانک طوفان اٹھا۔ بادل گرجنے لگے، برق و رعد نے سنسان فضا کو لرزا دیا۔ پنّوں پکارتا جا رہا تھا۔ "سسّی، چاند" لیکن چاند تو اس وقت بادلوں کے بھیانک گھیرے میں چھپ گیا تھا۔ اتنے میں اُسے دُور سے آگ جلتی ہوئی نظر آئی اور وہ ادھر لپکا۔ جھونپڑے کے دروازے پر پنوار کھڑا ملا۔ پنّوں نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔ "تم نے میری سسّی کو دیکھا ہے"۔ پنوار رو رہا تھا۔ اس نے پنّوں کا ہاتھ پکڑا اور اسے وہاں لے آیا۔ جہاں سسّی زمین میں سما چکی تھی۔ اچانک برق چمکی اور پنّوں کو اس کی روشنی میں سسّی کے دوپٹے کا پلّو نظر آیا۔ جو زمین کے اوپر رہ گیا تھا۔ اُس نے ایسا محسوس کیا گویا کسی نے اسے پہاڑ سے پھینک دیا ہو اور وہ پتھروں اور چٹانوں سے ٹکراتا نیچے کی طرف لڑھک رہا ہو۔ اس نے پنوار کو پھر زور سے جھنجوڑا اور اپنا سوال دہرایا۔ پنوار روتا رہا۔ الفاظ اس کی زبان پر نہیں آتے تھے۔ بالآخر اس نے پنّوں کو ساری داستان سنائی۔ پنّوں دوپٹے کو چوم کر چلایا۔ سسّی زمین سے آواز آئی۔ "پنّوں" زمین دوبارہ شق ہو گئی اور پنّوں ہمیشہ کے لئے سسّی سے مل گیا، اس دنیا میں جہاں کوئی اُنہیں جدا نہ کر سکتا تھا۔

سُر سسّی

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

ترجمہ: عاصمہ حسین

کافیوں اور وائیوں کے علاوہ بھٹائیؒ کے "رسالو" کا ایک اہم حصہ وہ نظمیں ہیں جن کو وہ "سُر" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مثلاً سُر سسّی، سُر ماروی، سُر سوہنی، سُر ایمن، سُر حسینی وغیرہ۔ ان کا صحیح اندازہ ان کے مطالعہ سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ یہ سُر درحقیقت راگ کے نہیں اور نہ ان کا راگ سے کوئی نمایاں تعلق ہے۔ شاید بعض سُر مثلاً سر ایمن، سر سورٹھ، سر کدارو کا تعلق اس نام کے معروف راگوں سے ہو اور ان عنوانوں سے لکھی ہوئی نظمیں ان راگوں میں گائی جاتی ہوں، کیونکہ یہ اس دور کی یادگار ہیں جب شاعری اور گائکی آپس میں بالکل گھلی ملی ہوئی تھیں۔ لیکن سر سسی یا سر ماروی میں کوئی ایسا واضح رشتہ نظر نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ سُر سے مراد لے یا نظم ہے۔

جہاں تک نظموں کا تعلق ہے ان کی کیفیت بھی انوکھی ہے وہ نہ تو پوری طرح غنائیہ ہیں اور نہ ڈرامائی۔ شاعر ان میں براہِ راست اپنے احساسات یا افکار پیش نہیں کرتا، بلکہ جو کچھ کہتا ہے اپنے کرداروں کی زبانی کہتا ہے، ماسوا ان مقامات کے جہاں ڈراما نگار خود کردار بن کر "لطیف چئی" یا "سید چئی" کے تحت اس کا پارٹ ادا کرتا ہے، اور حالات پر تبصرہ کرتا ہے۔ یا پھر وہ ان کی بپتا یا کتھا کے بعض پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔ گویا نظم کی غنائیہ نے دو طرح کی ہے۔ ایک شاعر کی اپنی کیفیات کی بلاواسطہ ترجمانی اور دوسری کرداروں کے احساسات کی ترجمانی انہی کی زبانی۔ براؤننگ کی طرح اسکی شاعری بھی "افتادوں" کی شاعری ہے۔ بنیادی حیثیت سے وہ ایک "دانائے راز" ہے۔ ایک عارف

جس کو صرف اپنے دھنی (واحد، مالک، قدیم) ہی سے سروکار ہے۔ اور وہ اپنی روح کو زیادہ سے زیادہ قوی بنانے کے لئے حق سے قریب اور غیر حق کی کدورتوں سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کا مطمح نظر روح کی توانائی ہے۔ اس کے لئے انسان کی زندگی کا سب سے اہم معاملہ اپنی روح کو بے داغ رکھنا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ توانائی پیدا کرے۔ اس کی بہترین علامت ماروی ہے جو کسی قیمت پر بھی اپنی آن یعنی روحانی وجاہت بلکہ وسیع ترین معنوں میں اپنی 'خودی' کو ان عناصر کے حوالے نہیں کرنا چاہتی جو اس کے منافی ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں بے اختیار ایک مغربی مصنف کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں کہ "اگر ہم سب کچھ پالیں لیکن اپنی روح کو کھو بیٹھیں تو ہمیں کیا حاصل ہوگا؟" درحقیقت بھٹائی کی "روح" خودی یا ذات ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور اس کو ان تمام تخریبی عناصر سے محفوظ رکھنا جو اس کی نفی کرتے ہیں، اس کا محبوب ترین نصب العین ہے۔ وہ سوہنی کی اس لئے تعریف کرتا ہے کہ اس نے دنیا کی پروا نہ کی، ذاتی آفات و مصائب کی پروانہ کی، طوفانِ حوادث کی پروانہ کی۔ بلکہ اپنے محبوب (جس کو ہم عام معنوں میں نصب العین بھی قرار دے سکتے ہیں) کے عشق میں سرشار ہوکر، اپنی قوتِ ارادی کا علم بلند کرتے ہوئے تمام انسانی اور قدرتی طوفانوں کے خلاف سینہ سپر ہوگئی۔ سسی کو صرف اتنا افسوس ہے کہ اس نے ذرہ بھر غفلت کی اور اس کا محبوب اس کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد۔ تاہم وہ برابر اپنے محبوب کی لگن میں محو ہے، اس کی تلاش میں خندہ پیشانی سے ہر قسم کی مصیبتیں سہتی ہے، اس کی نظر ایک بلند مقام پر ہے، وہ نومید نہیں ہوتی۔ اور اپنی جان تک دینے سے دریغ نہیں کرتی۔ اسی طرح مومل کو بھی افسوس ہے کہ اس نے معمولی ہار کے لئے اپنی روح کی عظمت گنوا دی۔ غرض بھٹائی کا مدعا یہ ہے کہ وہ کبھی اپنی زبان، کبھی خارجاً شاعر کی حیثیت سے اور کبھی کرداروں کی زبانی کسی افتاد کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرے اور ہر رُخ، ہر حیثیت سے ایک ہی بنیادی حقیقت ـــــ 'روح کا عروج یا زوال' واضح کرے۔ وہ روح کی دھوپ چھاؤں، اجالوں اندھیروں کا شاعر ہے۔ اسی لئے اس کی تکنیک براؤننگ سے ملتی جلتی ہے۔ جس کا عقیدہ یہ تھا کہ "ہم انسانوں کے لئے بہترین موضوع انسان ہی ہے۔" اس کے بعض پارے ڈرامائی خود کلامی معلوم ہوتے

ہیں، اگرچہ ان میں پلاٹ یا کرداری تجزیہ کا وہ اہتمام نہیں جو براؤننگ میں ہے اور جو اسی کا حصّہ ہے۔
سُرسسئی میں زیادہ تر کلام سسّی ہی کی زبانی ہے یا "لطیف چئی" کے زیرِ تحت بھٹائی کی زبانی
کہیں کہیں پوری طرح یہ واضح نہیں ہوتا کہ متکلّم کون ہے، شاعر یا سسّی۔ پھر بھی ہم ایسے پاروں
کو سسّی ہی سے منسوب کر سکتے ہیں۔ شاہ لطیف کے کلام میں کردار اور شاعر کا یوں خلط ملط ہونا
بہت عام ہے، اس لئے کہ وہ اپنے کرداروں کے پردہ میں خود ہی بولتے ہیں۔ ان کا سایہ کبھی ان سے
پرے نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ابتدائی قسم کی تمثیلوں میں عموماً ہوتا ہے۔ ڈراما نگار خود اسٹیج پر آدھمکتا ہے
اور اداکاری کا لباس پرے پھینک کر خود اداکار بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنا اور کردار کا معاملہ واحد
سمجھتا ہے۔ اس کے لئے ڈرامہ، غنائیہ سے دور نہیں۔ پردہ تو محض نام کا ہے۔ لہٰذا بھٹائیؒ کی
نظمیں، ڈراما، غنائیہ اور واقعہ نگاری کا ملغوبہ ہیں۔

'افتادوں' کا شاعر ہونے کے معنی یہی ہیں کہ بھٹائی کوئی داستان گو نہیں۔ وہ افسانہ برائے
افسانہ کا قائل نہیں۔ اس کی داستانیں ہم پہلے ہی جانتے ہیں۔ صرف وہ کیفیتیں جو کسی افتاد سے
التزاماً یا امکاناً پیدا ہو سکتی ہیں، اس کی شاعری کا موضوع ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب بنیادی
حیثیت سے نہ ڈراما نگار تھے نہ داستان گو، وہ پیغامبر تھے۔ وہ مردِ حق پرست جس کا تمام تر زور
روح کی سطوت پر تھا۔ اور جو دھنی کی عبودیت پر بھی اسی لئے زور دیتے تھے کہ انسان کی روح اپنے
مرتبۂ عالی کو پہنچ جائے۔ یہ پیغامبر، یہ "مردِ خودی پرست" ہر وقت اپنے کلام کے پاس رہتا ہے،
وہ اس میں پوری طرح رچا ہوا ہے۔ بھٹائیؒ کا مسلک صوفیانہ خلوت پسندی اور تجرد نہیں۔ اگر وہ روح
کی توانائی پر زور دیتے ہیں تو صرف اس لئے کہ ہم زندگی میں اس کا مصرف پیدا کریں۔ ان کی بہترین
ہیروئن ماروی زندگی ہی کی ایک افتاد کا سامنا کرتی ہے۔

سُرسسئی چھیالیس چھوٹے بڑے بندوں پر مشتمل ہے

سسّی (۱)

کیا چیخوں میں، کیا چلّاؤں
لوگ کہیں گے دیوانی ہے

اچھا یونہی سہی، کہنے دو
مستانی ہے مستانی ہے

×

چیخیں مری دلدوز ہیں پھر کیا
لوگ اُٹھیں سن سن کر آئیں
برا بھلا کہتے ہیں کہہ لیں
ان باتوں پر شرم دلائیں

*

اس میں لاج کی بات ہی کیا ہے
بڑھے چلے جاؤں گی برابر
خواہ بدن ہو پارہ پارہ
اپنے پیا پیارے کی رَہ پر

(۲)

ضبط کروں کتنا ہی میں
کیسے رہوں بن ماہی میں
غم ہی غم ہے ٹوٹ پڑا
دل پہ مرے دلدار بنا

*

جا اے آنے والے کل
تیرے سب وعدے چھل بل
ان پہ بھروسہ کیسے کروں
جیون کو ترساتی رہوں
کل تک صبر کروں مشکل
ہائے یہ میرا بیا کل دل
جانی آ، کل تک مل جا

یا مجھے موت کی راہ دکھا
درشن دے یا موت مجھے
ڈھونڈتی ہوں ہر اور تجھے
مان لے مان لے بات مری
مجھ کو دکھا صورت اپنی

سید:

اے دکھیا، اے غم کی ماری
بھول بھی جا یہ غم کی باتیں
چھوڑ دے اپنی سیج سجیلی
دیکھ یہ جلتی بھنتی چٹانیں

*

ان پر چل کر ڈھونڈھ نشانی
ہنوں راجن کے پاؤں کی
دیکھو سراپ سے اس دکھیا کے
چیخ اٹھی ہے گھاٹی گھاٹی

*

مر جائے تو جنگل جنگل
سارے ہرن رہ رہ کے پکاریں
ہائے اس دکھیا نے مر کر
دکھیا کیں ہرنوں کی ڈاریں

*

مر گئے ہم اس کے مرنے سے

اس کی موت نے ہم کو مارا
اس کا دکھ ہم سب کا دکھ ہے
سائیں سائیں کرے بَن سارا

اے دکھیاری تیرے کارن
بنجر ہے یہ سب ویرانہ
برکھا برسے دھائیں دھائیں

پھر بھی اُگے کب ایک بھی دانہ

★

پھل پھلواری دین ہیں اسکی
جو ہے کُل جگ کا ان داتا
ہاتھ اسی کے سامنے پھیلا
مانگیں اسی سے رزق سدا

★

سسی:

(۳)

خدا کرے کہ کہیں پھر وہ روزگار آئے
کہ یار بچھڑے ہوئے یار کے کنار آئے

چلو چلو، اسی رہ پر چلو کہ دل نہ کہیں
امید باختہ، فصل خوش گوار آئے

امید آج ابھرتی ہے دل میں رہ رہ کر
بچھاؤں راہ میں آنکھیں جو وہ نگار آئے

بچھایا میں نے ہے آنکھوں کو راہِ جاناں میں
خوشا جو اس کا قدم سوئے رہگزار آئے

نہ جانے ان کو گئے آج کتنے جگ بیتے
کبھی تو بھول کے یارب وہ شہسوار آئے

گیا جہاں سے مرا دوست پھر وہیں آئے
پیالہ گھوم کے پھر سوئے بادہ خوار آئے

مری امید بھی اتنی ہے جتنا نام ترا
کمالِ صبر سے ہی روح کو قرار آئے

تسلیٔ دلِ مایوس ہے ترے دم سے
ترا ہی نام ہے جو لب پہ بار بار آئے
ہے نقش دل پہ جو میرے رضائے مولا کا
مری امید بھی ایسی ہی سازگار آئے
نہ تیرے در سا کوئی در نہ آسرا تجھ سا
ترے حضور ہر اک پیکر نزار آئے
بہت ہی دیکھے ہیں دروازے اور درگاہیں
کہاں سے تجھ سا الٰہی کرم شعار آئے
نہ چھوڑ اپنے کرم سے تو اس کے دامن کو
جو پاس تیرے بہ ایں حال اشکبار آئے
ہر ایک بے کس و تنہا کی تو ہے پشت و پناہ
نہ پاس کیوں ترے جاں بہر زینہار آئے

★

سُردیسی
(سات دشمن)

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ
ترجمہ: حفیظ ہوشیارپوری

پنّوں کی تلاش میں سسّی ماری ماری پھرتی ہے یہاں تک کہ سورج غروب ہو جاتا ہے۔
اس موقع پر شاہ بھٹائی نے "سُر دیسی" کی پہلی داستان میں سسّی کی زبان سے چند ابیات کہلائی ہیں جن میں وہ اپنے ان سات دشمنوں کا ذکر کرتی ہے:
(۱) اونٹ (۲) ساربان (۳) پنّوں کے بھائی (۴) سورج (۵) چاند (۶) ہوا (۷) پہاڑ۔۔

ناقۂ بے مہر، سارباں دشمن
سربسر اہلِ کارواں دشمن
وقت سے پہلے ہو گیا روپوش
آفتابِ مسافراں دشمن
جانے کس انتظار میں ہے ابھی
نورِ مہتابِ عاشقاں دشمن
قافلے کے نقوشِ پا معدوم!
صرصرِ تند، بے گماں، دشمن
سختیٔ راہِ خم بہ خم جانکاہ
ہیبتِ کوہِ سرگراں دشمن
آج شاید کہیں اماں نہ ملے
سفرِ عشق ہے اماں دشمن

مومل رانو

اللہ بخش عقیلی

سندھ کے نوجوان عرب فاتح محمد بن قاسم نے فتوحات سندھ کے دوران میں یہ اصول رکھا تھا کہ جو مقامی ہندو حاکم خود ہی اطاعت کر لیتا۔ اُسے اپنے مقبوضہ علاقے پر قائم رہنے دیتا۔ اور اسلامی فوج کی حفاظت کی ذمہ داری کے عوض اُس کو صرف شرعی جزیہ کی معمولی رقم اپنی ریاست کی غیر مسلم مردم شماری کے مطابق ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس قسم کی بہت سی ہندو ریاستیں سندھ کے اطراف میں صدیوں تک قائم رہیں۔ اور مسلمانوں کے اوائلی عہد کا پاس رکھتے ہوئے بعد کے مسلمان حکمراں خاندانوں نے بھی اُن سے کوئی تعرض نہ کیا۔ فتح سندھ کے بعد پہلے تو خلفائے دمشق و بغداد سندھ کے گورنر مقرر کرتے رہے اور بعد میں جب دُور دُور کی ریاستیں خود مختار ہو گئیں تو سندھ میں بھی ہباری خاندان کی ایک خود مختار حکومت قائم ہو گئی۔

چوتھی صدی ہجری کے آخر میں جب اسماعیلی قرامطہ سندھ پر مسلّط ہو گئے تو سلطان محمود غزنوی نے فوج کشی کر کے سندھ کو اپنے زیرِ نگیں کر لیا۔ لیکن جب محمود غزنوی کے جانشیں خانہ جنگی میں مبتلا ہوئے تو جنوبی سندھ پر ایک نو مسلم راجپوت قوم نے قبضہ کر لیا، جس کو "سومرہ" کہا جاتا ہے۔ اسی سومرہ خاندان کے آخری بادشاہ حمیر سومرہ کے زمانے کا ایک واقعہ ہے جو ہم بیان کر رہے ہیں۔ اور

جو سندھ کے قدیم رومانی افسانوں میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت زیادہ مقبول ہے۔ اور سندھی زبان کے شعرا نے اس کو نظم کی صورت میں ڈھال کر اور بھی رومانی اور دِل کش بنا دیا ہے۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اس وقت سندھ کی جنوب مغربی سرحد پر ایک چھوٹی سی ہندو ریاست تھی جس کا صدر مقام "کاک" تھا۔ آج بھی سندھ کی جنوب مغربی سرحد پر جو آخری تحصیل "شابندر" ہے اس کا جنوب مغربی حصّہ "کاک مکان" کہلاتا ہے۔ جس سے تھوڑے ہی فاصلے پر سندھ ندی کی آخری شاخ سمندر سے مل جاتی ہے۔ ان ہندو ریاستوں کے حاکم "رانا" کہلاتے تھے۔ کاک ریاست کا راجہ رانا نند نامی گوجر قوم سے تھا۔ اس راجہ کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ صرف دو حسین لڑکیاں تھیں۔ بڑی کا نام "مومل" اور چھوٹی کا نام "سومل" تھا۔ یہ خالص سندھی نام ہیں اور حسین و نازک اندام کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ ابھی دونوں کنواری ہی تھیں کہ راجہ نند کا انتقال ہو گیا۔ اور ریاست کی باگ دوڑ بڑی لڑکی "مومل" کو سنبھالنا پڑی۔ "مومل" حسین اور ذہین بھی تھی۔ اُس نے باپ کی ریاست کو سنبھال تو لیا۔ لیکن پھر بھی اس کو ایک ایسے شریک حیات کی ضرورت تھی جو نہ صرف اس کا خاوند بنے بلکہ ریاست کے کاروبار میں بھی اس کا ساتھی بن کر اس کا بوجھ ہلکا کرے۔ اس لئے ضروری تھا کہ وہ شوہر منتخب کرنے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ آیا اُس کے ساتھ زوجیت کے تعلقات قائم کرنے کی تمنا رکھنے والا صرف اس کے خداداد حُسن اور ریاست کی دولت ہی چاہتا ہے یا اِس کے علاوہ ہوشیار، سلیقہ مند، دانا اور دلیر بھی ہے۔

اس انتخاب کو کامیاب بنانے کے لئے مومل نے ایک نہایت انوکھی ترکیب نکالی۔ کاک میں اس نے ایک ایسا محل تیار کرایا۔ جس کا بیرونی حصّہ شیشے کا تھا۔ اور اُس کے چاروں طرف کا میدان اتنا صاف و شفاف رکھا کہ شیشے کا عکس پڑنے سے اس پر جو پانی کی تہ رکھی گئی تھی وہ بہت گہری نظر آتی تھی اور یوں دکھائی دیتا تھا کہ

سارا محل پانی کی جھیل کے اوپر کھڑا ہے اور محل تک پہنچنے کے لئے ایک بڑا فاصلہ گہرے پانی سے تیر کر گزرنا پڑے گا محل کے چاروں طرف پانی کی یہ چھوٹی تہ اس صنعت کے ساتھ قائم کی گئی تھی کہ اس میں کسی وقت فرق نہیں آتا تھا اور پانی کا بہاؤ متواتر محسوس ہوتا تھا۔ اس وقت بھی "کاک مکان" کے مغرب سے ندی کی بڑی شاخ بہتی ہے۔ جسے ٹنی دریا کہتے ہیں۔ اور جنوب سے دوسری چھوٹی شاخ بہتی ہے۔ جسے "ہنرمالی" کہتے ہیں۔ اور سمندر کے نزدیک ہونے کے سبب ان کا پانی چڑھتا اور اترتا رہتا ہے اور سمندر کے قدرتی مدوجزر کا اس جگہ کافی دخل ہے۔ ممکن ہے کہ اسی مدوجزر سے فائدہ اٹھا کر پانی کا بہاؤ ایک خاص انداز پر قائم رکھا گیا ہو۔ بہرحال لوگ اسے جادو کا کرشمہ سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ محل کے چاروں طرف شیروں کے مجسمے اس طریقے سے نصب کئے گئے تھے کہ دُور سے دیکھنے والے کو اصلی شیر دکھائی دیتے تھے۔ اس کے علاوہ اُن کی یہ خوبی بھی تھی کہ ایک کونے پر ایک شیر بیٹھا ہوا نظر آتا تھا تو دوسرے کونے پر وہی شیر دوڑتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ جس طرح آج کل فلم میں ایک تصویر کے مختلف عکس مل کر ایک متواتر حرکت بن جاتے ہیں۔ بہرحال محل کو پانی کے اندر گھرا ہوا دکھانا اور شیروں کا اس کے گرد گھومنا ایک صنعت تھی۔ جو طلسم یا جادو نظر آتا تھا۔ موہل کے محل میں یہ دو جادو تھے۔ اگر کوئی پانی سے گزر کر اور شیروں کے آگے سے بھی نکل کر موہل کے محل میں پہنچ جاتا تو یہاں اس کے لئے ایک تیسری آزمائش تھی۔ وہ یہ کہ محل کے صحن میں سات کھٹولے ڈالے گئے۔ جن میں چھ کی نواڑ کچے دھاگے کی تھی، کہ آدمی کے بیٹھتے ہی ٹوٹ جائے۔ باقی ایک تخت پکی نواڑ کا تھا۔ جس پر آدمی بیٹھ سکے۔ اس اہتمام کے بعد موہل نے اعلان کر دیا کہ جو کوئی اس طلسمی قصر میں داخل ہو کر تخت پر جلوس کرنے کی جرأت کرے گا۔ میں اُسی سے شادی کروں گی۔ ملکہ کے حُسن کا شہرہ سُن کر بہت سے امیدواروں نے محل کا قصد کیا۔ مگر کچھ تو پانی سے ڈر کر رہ گئے، کچھ

شیروں سے گھبرا گئے۔ اور کچھ اندر داخل ہونے کے بعد کسی دھوکے والے تخت پر بیٹھنے کے سبب گر گئے۔ اور ناکام رہے۔ سندھ۔ کچھ، کاٹھیاواڑ کے بہت امیر زادوں کو اس مصنوعی طلسم نے پریشان اور ناکام کر دیا۔ جنوبی سندھ کا حاکم حمیر سومرہ ایک دفعہ شکار کھیلنے گیا ہوا تھا۔ اُس کا وزیر اعظم رانا ہندرہ اور دوسرے وزیر اس کے ساتھ تھے۔ اس راستہ میں انھیں ایک امیر زادہ ملا جو یہاں سے ناکام ہو کر فقیر ہو گیا تھا۔ اُس نے انھیں اپنی داستان سنائی تو حمیر سومرہ کو بھی اس کا اشتیاق اور خیال پیدا ہوا۔ تینوں وزیر ساتھ لے کر کاک جا نکلا۔ پہلے تو حمیر خود قصر کی طرف گیا۔ مگر پانی سے ہی گھبرا کے لوٹا۔ اس کے بعد دو چھوٹے وزیر ایک ایک کر کے گئے۔ مگر ناکام لوٹے۔ آخر میں رانا ہندرہ گیا۔ یہ سومرہ حکومت کا وزیر اعظم اور بادشاہ حمیر کا سالا بھی تھا۔ اُس نے ایک نیزہ ساتھ لے لیا تھا۔ پانی میں نیزہ گاڑ کر دیکھا تو پانی کم نظر آیا اور یہ اُس سے گزر گیا۔ پھر شیروں کو نیزے سے جھنجھوڑا تو مجسمے نظر آئے۔ محل میں جا کر سات پلنگ دیکھے تو یہاں بھی عقل سے کام لیا کہ ان میں ضرور کوئی راز ہے۔ ہر ایک میں نیزہ لگا کے دیکھا جو کچے دھاگے کے تھے یک دم ٹوٹتے چلے گئے جب پکے تخت کی اچھی طرح تسلی کر لی تو اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس طرح مومل کی شرائط اُس نے پوری کر دیں اور مومل نے اس سے شادی کر لی۔ لیکن لوٹنے کے بعد اُس کے بہنوئی حمیر نے حسد کے سبب اُس کو اپنے پایۂ تخت میں جا کر قید کر دیا۔

اب رانا ہندرہ اور مومل کو ایک دوسرے سے عشق ہو گیا تھا۔ حمیر نے رانا کو قید کر کے اُن کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنا چاہا۔ یہاں جذبۂ عشق نے رانا ہندرہ کی رہبری کی۔ وہ ہر شب اپنے قید خانے سے بھاگتا اور ایک سانڈنی پر سوار ہو کر مومل کے پاس کاک پہنچ جاتا اور صبح ہونے سے پہلے واپس قید خانہ میں آجاتا۔ تاکہ حمیر کو خبر نہ ہو۔ اور کم از کم یہ پوشیدہ ملاقات کا تعلق ہی مومل کے ساتھ قائم رہے کہتے ہیں دو دل مل جائیں تو زمانہ ان کا دشمن بن جاتا ہے۔ یہاں رانا ہندرہ پر حمیر کی پابندیاں تھیں۔

وہاں کاک میں مومل کی بہن سومل کو شرارت سوجھی۔ کہ ایک رات کو مردانہ لباس پہن کر اپنی بہن مومل کے پاس سوگئی۔ اور جیسے ہی حسب معمول رانا ہندرہ آیا تو دور سے سمجھا کہ کوئی غیر مرد مومل کے ساتھ سویا ہوا ہے، وہیں سے اُلٹے پاؤں واپس لوٹ آیا۔ اور مومل سے ہمیشہ کے لئے بدظن ہوگیا۔ اس طرح جہاں شاہی قید و بند اور زنجیریں بھی اُسے اپنے محبوب سے الگ نہ کرسکیں۔ وہاں ایک بدگمانی کام کرگئی۔ اور شکستہ دل ہندرہ دنیوی کاروبار چھوڑ چھاڑ کر اپنے گاؤں ڈٹ میں گوشہ نشین ہوگیا۔ مومل کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو بہت بے چین ہوئی اور پریشان ہوکر سومل سے قطع تعلق کرلیا اور کاک کی حکومت کو بھی خیر باد کہا۔ ہندرہ کے گاؤں 'ڈٹ' میں جاکر ہندرہ کے محل کے نزدیک ایک گھر بسایا اور اُس میں زندگی بسر کرنے لگی، کہ کبھی ہندرہ محل سے باہر آئے تو اُسے صحیح واقعات بتاکر اس کی غلط فہمی دور کرنے کا موقع ملے۔ مگر ہندرہ کا دل کچھ اس طرح ٹوٹا کہ اُس نے آنا جانا اور کسی سے ملنا جلنا ترک کردیا۔

مومل نے ہر ممکن کوشش کی اور ناکام رہی اور آخر اس دُکھ اور مایوسی میں دنیا سے چل بسی۔ رانا ہندرہ کو جب یہ سب کچھ معلوم ہوا تو اُسے ہوش آیا لیکن اب اسے کہاں ڈھونڈتا۔ وہ ہمیشہ کے لئے اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ اُس کے عشق میں جل کر راکھ ہوگیا تھا۔ اور اسی غم میں اس کی حیات کا چراغ بھی گل ہوگیا۔

یہ ہے وہ داستان جسے شاہ عبداللطیف اور سچل سرمست اور دیگر شعرا نے عشقِ حقیقی کا جامہ پہنا کر اس طرح نظم کیا ہے کہ سننے والے وجد میں آجاتے ہیں۔

سُر مومل رانو

شاہ عبد اللطیف بھٹائی

مترجمہ : لطف اللہ بدوی

وائی

فکر تیاری کی کر ساتھی سدا ۔۔۔ رہ ہمیشہ رہ سپار
کاک چلنا ہے کبھی
راہرو کتنے لڈونے کو گئے ۔۔۔ ہو نہیں سکتا شمار
کاک چلنا ہے کبھی
جو گیا ہے لوٹ کر آیا نہیں ۔۔۔ موت پر کیا اختیار؟
کاک چلنا ہے کبھی
ایکدن آئیگا پیغامِ رحیل ۔۔۔ یہ حیاتِ مستعار
کاک چلنا ہے کبھی
موت لیجائیگی تجھ کو ایکدن ۔۔۔ کوچ کا کر انتظار
کاک چلنا ہے کبھی
سوئے دلبر اب چلا عبد اللطیف ۔۔۔ چھوڑ کر سب انتشار.
کاک چلنا ہے کبھی

•

داستانِ چہارم

شمع ساری رات جلتی ہی رہی
صبح کی آخر کرن آئی نظر
لوٹ آ رانا خدا کے واسطے!
یہ جُدائی موت سے ہے سخت تر
یاد میں تیرے اُڑاتی ہی رہی
کاگ کے کوّے بنا کر نامہ بر

چھلئے تارے دیکھتے ہی دیکھتے
چھپ گئی آخر یہ شب کی رہگذر
یاد میں کرتی رہی تا صبحدم
میندھرہ! ناقہ کو روتے رات بھر

میں نے روشن کر رکھا ہے تا سحر
یہ معطر تیل سے جلتا دیا
پڑ گیا شاید کچھ ایسا اتفاق
ڈھٹ نے روکا مگر میرا پیا
چڑھ کے ناقے پر تو آجا لال پھر
کاگ کے کوّے اڑاؤں تا کجا؟
لوگو آگے کرتے روغن جل گیا
ہاں مسافر دوست آجا ناقہ پر
غمکدہ میں تیرا کرتے انتظار
رات روتے ہو گئی میری بسر

جھلملا کر مات تارے ہو گئے
مُڑ گئی پروین، ثریا کی قطار
آہ! پر رانا نہ آیا وقت پر
کٹ گئی یہ رات کرتے انتظار
نحس شب جا دُور ہو جا بدنصیب
تو فراقِ یار سے ہے داغدار
مطمئن ہو کر وہ بیٹھے ڈھٹ میں
اور میں تنہا ہوں خوار و اشکبار

اُڑ رہی ہے خاک دیواروں پہ اب
دوست بِن ہر چیز لگتی ہے اُداس
خانۂ دل ہو گیا ویراں ندیم
چھا گیا دل پر جدائی کا ہراس
تجھ سے دل کا ہے تعلق اسلئے
قاصدوں کی اب لگی رہتی ہے آس

تو ہی ہے بیتاب دل کا آسرا
تجھکو ہیں معلوم میرے سب گناہ
مجھ سے راحت چھٹ گئی سوڈھے بغیر
قاصدوں پر اب تو رہتی ہے نگاہ
ڈھٹ سے ڈھاٹی تو آتے ہیں ہزار
لیک سوڈھے بِن نہیں آتا قرار

چھٹ گئی آرام و راحت کی اُمید
میند ھرے نے کر دیا دل کو فگار
میں بھلاتی ہوں نگاہوں سے اسے
پر بُھلا سکتی نہیں ہوں اس کا پیار

رات کہہ دیں اس نے باتیں راز کی
ہو گئی ہے تلخ جن سے زندگی
آس رکھتی ہوں کہ شاید لوٹ کر
دل کے ویرانے کو بخشے تازگی

وائی

رات روتے ہو گئی میری بسر	پھیر کر ناقہ کولا
ہاں خدا کے واسطے	پھیر کر ناقہ کولا
چھوڑ کر جانا نہ تجھ کو چاہیے	کاک سے یوں روٹھ کر
ہاں خدا کے واسطے	تو پھیر کر ناقہ کولا
یہ پلنگ اور یہ معطر بستر ے	بن گئے ایذا کا گھر
ہاں خدا کے واسطے	تو پھیر کر ناقہ کولا
مجھکو طعنے دیتے ہیں سب ہمنشیں	پھیر لی تو نے نظر
ہاں خدا کے واسطے	تو پھیر کر ناقہ کولا
ہو وصال یار پھر عبد اللطیف	جیتی ہوں اِس آس پر
ہاں خدا کے واسطے	تو پھیر کر ناقہ کولا

•

عمر ماروی

سیّد علی ملتانی

قیام پاکستان سے کئی سو برس قبل کا ذکر ہے کہ عمر کوٹ میں شاہ عمر نام کا ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ یہ بادشاہ سومرہ قوم کا فرد تھا۔ جو قرامطی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور سندھ بھر کے نہ صرف حاکم بلکہ روحانی پیشوا بھی سمجھے جاتے تھے۔ شاہ عمر میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے جو ایک اچھے بادشاہ میں ہونے چاہئیں۔ ہمت و شجاعت تو اس کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ فتح و ظفر ہمیشہ اس کے ہم عناں رہتی تھی۔ جہاں جاتا کامیاب و کامران لوٹ کر آتا۔ عدل و انصاف کا یہ حال تھا کہ کوئی فریادی بھی اس کے دربار میں حاضر ہو کر شاکی نہیں جاتا تھا۔

کہا گیا ہے کہ بے عیب صرف خدا کی ذات ہے۔ شاہ عمر میں ہزاروں خوبیاں ہوں مگر ایک واقعہ اس کی سوانح حیات میں بھی ایسا آیا جس کی وجہ سے اس کی زندگی داغ دار ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے:۔

"ایک روز کا ذکر ہے کہ شاہ عمر دربار میں بیٹھ کر اپنے امیروں۔ وزیروں اور درباریوں کو عدل و انصاف کی نصیحت کر رہا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ جس طرح چونے اور گارے کے بغیر کوئی دیوار کھڑی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح عدل و انصاف کے بغیر بھی کوئی سلطنت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی۔ آخر میں اس نے اپنے تمام امیروں۔ وزیروں اور درباریوں کو پُرزور الفاظ

میں تلقین کی۔ کہ وہ ظلم و ستم اور جور و جفا سے احتراز کریں جو خدا کی نظر میں سب سے گھناونا فعل ہے اور اس طبقہ کے لئے جو اولی الامر کہلاتے ہیں۔ زہر ہلاہل کا کام کرتا ہے۔ ابھی وہ اس قسم کے مواعظ اور نصائح میں مشغول ہی تھا۔ کہ ایک نوجوان اس کے قصر سلطنت کے دروازے پر آ گر رکا اور بادشاہ سے تنہائی میں ملاقات کرنے کی اجازت چاہی۔ بادشاہ نے بھی کوئی ستم دیدہ سمجھ کر دربار برخاست کر دیا تاکہ اس کی کہانی اطمینان کے ساتھ سن سکے۔

جس زمانے میں عمر بادشاہ عمر کوٹ پر حکومت کرتا تھا اسی زمانے میں ملیر نام کی ایک بستی میں جو صحرائے تھار میں واقع ہے، پلوی نام کا ایک غریب گڈریا رہتا تھا۔ خدا نے اُسے ماروی نام کی ایک خوبصورت۔ خوب سیرت دختر عطا کی تھی جو حسن و جمال میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ ابھی ماروی بہت ہی کمسن تھی کہ پلوی نے ماروی کی منگنی اپنے بھائی کے بڑے بیٹے کھیٹ کے ساتھ کر دی جو مردانہ حسن و جمال میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ ماروی اور کھیٹ بچپن سے ہی ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرتے تھے۔ مگر ان کی یہ محبت ایک شخص کو بالکل نہیں بھاتی تھی۔ وہ شخص تھا پلوی کا نوکر پھوگ۔ جو بچپن ہی سے پلوی کے گھر میں رہتا اور اس کی بھیڑ بکریاں چرایا کرتا تھا۔ دراصل یہ شخص ماروی پر ہزار جان سے شیدا تھا۔ شروع شروع میں اس کا خیال تھا کہ وہ ماروی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے گا۔ لیکن جب اسے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی، تو وہ حسد کے مارے جل اٹھا اور بدلہ لینے کے لئے عمر کوٹ روانہ ہو گیا۔ تاکہ ماروی اور کھیٹ کو ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا کر کے اپنی شکست کا بدلہ لے۔ چنانچہ وہ شخص جو قصر شاہی کے سامنے عمر بادشاہ سے تنہائی میں ملاقات کرنے کے لئے آیا تھا۔ ماروی کا ناکام و نامراد عاشق پھوگ ہی تھا

جب شاہ عمر نے پھوگ کو خلوت میں باریابی بخشی تو پھوگ نے اس کے قدموں پر گر کر کہا "اے بادشاہ! میں آپ سے کچھ مانگنے یا داد فریاد کرنے نہیں آیا بلکہ آپ کو ایک خوش خبری سنانے آیا ہوں کہ ملیر نامی کی بستی میں جو یہاں سے چند میل کے فاصلہ پر صحرا میں واقع ہے۔ ماروی نام کی ایک لڑکی رہتی ہے۔ یہ لڑکی حسن و جمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ کیا قد و قامت اور کیا خد و خال سب میں بے عیب ہے۔ اس کی مخمور سیاہ آنکھیں نرگس کو شرماتی ہیں۔ چہرہ ایسا خوبصورت

ہے کہ چاند بھی اس کے سامنے کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ جب وہ مسکراتی ہے تو موتی بکھرتے ہیں۔ بات کرتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں۔ اس کی مرمریں باہیں اور گلابی رخسار دیکھ کر انسان تو انسان فرشتے بھی عش عش کر اٹھتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی انسان اسے دیکھے اور پھر کسی دوسری چیز کی یاد میں پڑ جائے۔ بادشاہ! یہ سب کچھ ہے۔ مگر وہ ایک گڈریئے کی لڑکی ہے۔ اگر آپ کی نظر عنایت اس پر نہ ہوئی تو وہ تمام عمر ایک گڈریئے کی لڑکی بنی رہے گی۔ نہ اس کی رہائش اچھی ہوگی اور نہ خوراک پوشاک، لیکن اگر وہ آپ کے حرم میں پہنچ جائے تو مجھے یقین ہے کہ یہاں اس کی زندگی بھی سنور جائے گی اور شاہی حرم کی رونق بھی بہت بڑھ جائے گی۔"

شاہ عمر جو ایک لحظہ قبل عدل و انصاف کی تلقین کر رہا تھا۔ ماروی کے حسن و جمال کی کہانی سن کر ایسا والہ و شیفتہ ہوا کہ اسے اپنے قول و قرار بھی یاد نہ رہے۔ اس نے فی الفور دو باد رفتار سانڈنیاں تیار کرائیں اور پھوگ کو ساتھ لے کر ملکیر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب شاہ عمر ماروی کے گاؤں ملکیر کے نزدیک پہنچا تو اتفاق سے ماروی بھی اپنی سہیلی کے ہمراہ کنوئیں سے پانی بھرنے کو نکل چکی تھی۔ ماروی نے دو اونٹوں کو کنوئیں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو بے حد ڈر گئی اور سہیلی کو لوٹ جانے کے لئے کہا۔ مگر سہیلی نے جو کسی قدر نڈر تھی ہنستے ہوئے کہا ڈرپوک کہیں کی، راہگیر ہوں گے۔ پانی پینا چاہتے ہوں گے۔ بہت کریں گے تو ہم سے پانی مانگیں گے۔ اس میں ڈر کی بات ہی کیا ہے؟ ماروی اپنی سہیلی کے اطمینان دلانے سے آگے بڑھی اور دونوں سہیلیاں پانی بھرنے لگیں۔

سانڈنی سوار جب کنوئیں کے پاس پہنچے تو پھوگ نے شاہ عمر کو دھیمی آواز میں بتلایا کہ ماروی یہی ہے۔ عمر بادشاہ نے جب ماروی پر نظر ڈالی تو اسے قیاس و گمان سے بھی کہیں زیادہ حسین پایا۔ جھٹ اونٹنی بٹھلائی اور پانی مانگنے کے بہانے اس کے پاس پہنچ گیا۔ ابھی وہ پانی پلا ہی رہی تھی۔ کہ پھوگ نے اسے اٹھا کر شاہ عمر کی اونٹنی پر بٹھلا دیا اور اسے لے کر دونوں کے دونوں عمر کوٹ روانہ ہو گئے۔

ماروی کا روتے روتے بُرا حال ہو گیا تھا۔ شاہ عمر نے اسے لاکھ سمجھایا بجھایا زر و جواہر کا

لالچ دیا۔ مگر ماروی کے آنسو نہ تھمنے تھے نہ تھمے جب اُسے اپنے ماں باپ اور پیارے منگیتر کی یاد آتی تھی تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے پھوٹ پڑتے تھے۔

بادشاہ نے جب یہ دیکھا کہ نرمی اور محبت سے کچھ کام نہیں چلتا تو اُسے دھمکایا۔ "کیا تیرے ماں باپ اور تیرا ہونے والا شوہر غریب گڈریئے نہیں جن کے پاس نہ کھانے کو ہے نہ پہننے کو؟ میں تجھے اپنی ملکہ بنانا چاہتا ہوں، تو میری سب سے چہیتی رانی ہوگی۔ بول کیا تجھے یہ پسند نہیں؟"

"بالکل ناپسند ہے"۔ ماروی نے جواب دیا "اے شاہ عمر! میرے ماں باپ نے میری نسبت ایک شخص سے کر دی ہے۔ میں جس کی بنتی تھی بن چکی۔ اب ہم لوگوں کو موت ہی ایک دوسرے سے جدا کر سکتی ہے"۔

"اے بادشاہ! مجھ غریب پر رحم فرما۔ ترس کھا اور مجھے اپنے لوگوں تک واپس پہنچادے۔ میں نے مانا کہ آپ کے ہاں مال و دولت کی فراوانی ہے لیکن ہم دیہات کے لوگوں کی نظر میں مال و دولت کی کوئی وقعت نہیں۔ ہمیں تو سیدھی سادی خوراک، پوشاک اور سادہ رہائش پسند ہے۔ آپ کے ان عالی شان محلوں اور مکانوں کی نسبت ہمیں اپنے حقیر جھونپڑے زیادہ عزیز ہیں۔ جن میں قدرت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے"۔

اس دوران میں ماروی کے ماں باپ کو ماروی کی سہیلی کی زبانی پتہ چل گیا کہ ماروی کو عمرکوٹ کا بادشاہ اٹھا کر لے گیا ہے۔ لہٰذا انھوں نے ماروی کے اچھے مستقبل کا خیال کر کے اُسے چھڑوانے کی زیادہ کوششیں نہ کی۔ لیکن ماروی کے منگیتر کھیتے نے ہمت نہ ہاری اور وہ فقیروں کا بھیس بدل کر عمرکوٹ پہنچ گیا۔

ایک روز کھیتے بھیک مانگتا مانگتا عین اسی کے محل کے سامنے پہنچ گیا جس میں ماروی مقید تھی۔ ماروی کی نظر بالاخانے سے کھیتے پر پڑی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور نامہ و پیغام کی تدبیر سوچنے لگے۔

اب کے شاہ عمر ماروی کو دیکھنے آیا تو ماروی نے شاہ سے وعدہ کیا کہ اگر بارہ مہینوں

گے اندر اندر ماروی کے ماں باپ اسے چھڑانے نہ آئے تو وہ ہمیشہ کے لئے اس کی ہو جائے گی۔ ماروی کے اس وعدے سے عمر کا دل باغ باغ ہو گیا اور اس نے بہت سی بندشیں جو ماروی پر عائد کر دی گئیں تھیں، ڈھیلی کر دیں۔

عمرکوٹ کے نواح میں ایک بزرگ کی خانقاہ واقع تھی۔ کھیتے نے ماروی کا پتہ لگانے کے بعد اپنا ڈیرہ وہیں لگا لیا۔ ماروی نے ایک نوکرانی کو اپنا ہمراز بنا لیا جو روزانہ اس خانقاہ پر پہنچتی اور کھیتے کو ماروی کے تمام منصوبوں سے آگاہ کرتی تھی۔

کھیتے اور ماروی کو جب ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح نامہ و پیام کرتے کرتے ایک عرصہ ہو گیا تو انھوں نے ایک تجویز سوچی۔ فیصلہ ہوا کہ ایک مقررہ دن کو شام کے وقت ماروی زیارت کے قصد سے خانقاہ پہنچے۔ وہاں پر کھیتے ایک تیز رفتار سانڈنی تیار رکھے گا اور اولیں موقع پاتے ہی ماروی کو سوار کر کے لے اڑے گا۔

جب مقررہ تاریخ آ پہنچی تو ماروی بہت سی خادماؤں کے ہمراہ شاہ عمر کی اجازت سے خانقاہ میں پہنچی اور مختلف طرح کے چڑھاوے چڑھانے اور دعائیں مانگنے لگی۔ ادھر کھیتا بھی تاک میں لگا ہوا تھا۔ اولیں فرصت میں اسے سانڈنی پر بٹھایہ جا وہ جا، نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ خادمائیں بہت چیخیں اور چلائیں لیکن آس پاس کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جو ان کی مدد کو آتا۔ ماروی جیسی آئی تھی ویسی ہی اپنے گھر میں پہنچ گئی۔ شاہ عمر نے لاکھ کوششیں کیں لیکن وہ اس طرح چھپا دی گئی کہ پھر اس کے ہاتھ نہ لگی۔

سُر ماروی

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ
ترجمہ : ابن انشاء

نہ بالوں کو دھونا دُھلانا اسے
نہ ہنسنا نہ پینا نہ کھانا اسے
عمر! — ماروی گیت گاتی پھرے
تری داد کے، تیری بیداد کے
ترا ظلم بخشا نہیں جائے گا!
یہ اک دن ترے سامنے آئیگا

نہ بالوں کو پانی دکھانا اسے
نہ زلفوں کی بگڑی بنانا اسے
وہ بانکے وہ سبزہ گھوں کے مکیں
انہیں ماروی بھول سکتی نہیں
عمر! ماروی کو کہاں یہ پسند
کہ بیٹھی رہے تیرے محلوں میں بند

نہ بالوں کو پانی دکھانا اسے
نہ زنداں سے باہر ہی جانا اسے
اسے بھائے کیا ماروؤں کے بنا
یہ صابن یہ خوشبو یہ عطر حنا
کٹھن ہے یہ اس کے لئے زندگی
کہ گوری ہے دیہات کی ماروی
نہ بالوں کو پانی دکھانا اسے
نہ بھولے سے بھی مسکرانا اسے
ہے کانوں میں اس کے صدا گونجتی
صدا اے عمر! تیرے انصاف کی
شکایت کرے ہے وہ اندوہگیں
مرے لوگ مجھ پاس آتے نہیں

اُداسی پہ مائل ہوئی ماروی
غمِ دل کی گھائل ہوئی ماروی
یہ اُلجھے سے گیسو یہ چہرہ اُداس
وہ اُٹھتی جوانی کی بو ہے نہ باس
غموں نے اُڑا دی ہے چہرے کی آب
اُداسی سے سنولا گیا ہے شباب

لیلاں چنیسر

ممتاز احمد سومرو

کسی زمانے میں کھنگھار نامی ہندو قوم کا ایک راجہ تھا۔ وہ سوڈھی راجپوتوں کی نسل میں سے تھا اور لکھپت کے صوبے پر اس کی حکومت تھی اس راجہ کی ایک نہایت ہی حسین و جمیل لڑکی تھی جس کا نام کونرو تھا اور اس کی منگنی اپنے چچا زاد بھائی اتمارٰی کے ساتھ ہو چکی تھی۔

کونرو کے منگیتر کی بہن کا نام جمنا تھا جو کونرو کی خاص سہیلی تھی اور دن رات اس کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی تھی۔ ایک دن اس نے کونرو سے کہا تم ہمارے قبیلے کی تمام لڑکیوں سے زیادہ حسین ہو اور ہمارے ملک کی شہزادی بھی ہو اس لئے تمہیں چاہئے کہ سب سہیلیوں کو روزانہ اپنے یہاں بلایا کرو۔ وہ اپنے اپنے چرخے لے کر تمہارے پاس آجایا کریں تاکہ ان کی میٹھی میٹھی باتوں سے تمہارا دل بہلتا رہے۔

کونرو نے جمنا کی اس تجویز پر عمل کیا اور اس کے گھر ہر روز اس کی سہیلیوں کی مجلس منعقد ہونے لگی۔ سب ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق میں اپنا وقت بسر کرتیں۔ کونرو سب سہیلیوں میں ممتاز تھی اور اسے اپنی ہم عمر لڑکیوں کے مقابلہ میں اپنے حسن پر بہت غرور تھا۔ اس کی ناز آفرینیاں اسے ایک جگہ چین سے

بیٹھنے نہیں دیتی تھیں اور وہ مجلس میں خاموشی سے نہیں بیٹھا کرتی تھی کبھی یہاں ہوتی اور کبھی وہاں۔ کبھی دروازے کے پاس تو کبھی کھڑکی میں سے جھانکتی ہوئی اپنے نازو انداز اور حسن و جمال کا مظاہرہ کرتی۔ دوسری لڑکیاں تو اس کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں لیکن جمنا اسے ہر وقت ڈانٹا کرتی۔ ایک روز وہ اپنے چنچل پن کی وجہ سے جو کود کر اٹھی تو اس کے دوپٹے کا آنچل جمنا کے چرخے سے جا اٹکا اور چوٹ لگنے سے چرخہ ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جمنا تو کونرو کی حرکتوں سے پہلے ہی تنگ تھی اب جو اس کا چرخہ ٹوٹا تو جھنجلا اٹھی اور کونرو کو طعنہ دے کر کہنے لگی: "تمہارا چھچھورا پن حد سے گزر گیا۔ میرے بھائی آنما دتی میں تو اتنی ہمت نہیں کہ وہ تم پر قابو رکھ سکے۔ چنیسر ہوتا تو شاید تمہارے یہ نخرے برداشت کر سکتا"

کونرو کے دل کو یہ بات تیر کی طرح لگی اور بات کا تبنگڑ بن گیا۔ وہ غصے سے لال پیلی ہو کر جمنا سے کہنے لگی: "اگر یہ بات ہے تو مجھے تیرے بھائی کی بھی کوئی ضرورت نہیں آج سے میں چنیسر کو اپنا شوہر سمجھوں گی۔" یہ کہہ کر کونرو سیدھی اپنی ماں مرکی کے پاس گئی اور جمنا کے طعنے کو کچھ اس انداز سے پیش کیا کہ وہ بھی ضد پر اتر آئی اور رانا کھنگھار کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا۔

ان سب میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ چنیسر کس طبیعت کا آدمی ہے کونرو کا رشتہ منظور کرے گا بھی یا نہیں اس کے باوجود کونرو اور اس کی ماں مرکی نے تاجروں کا بھیس بدل لیا اور چند نوکروں کے ساتھ توکل بر خدا چنیسر کی طرف چل پڑیں ان کا خیال تھا کہ وہاں پہنچ کر کوئی نہ کوئی مناسب تدبیر اختیار کریں گی۔

چنیسر دیبول کوٹ کا بادشاہ تھا۔ اس واقعے سے چند روز پہلے اس کی شادی لیلاں نامی ایک حسین لڑکی سے ہو چکی تھی اور دونوں میاں بیوی ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔

کونرو کا قافلہ کئی تکلیفوں کا سامنا کرتا ہوا آخر منزل مقصود تک جا پہنچا۔ ایک باغ میں فروکش ہوکر چنیسر کے وزیر جکھڑو کی خدمت میں جا حاضر ہوئے اور بہت عاجزانہ طریقے سے اظہار مدعا کیا۔ جکھڑو نے صرف اتنا وعدہ کیا کہ وہ ان کا پیغام چنیسر تک پہنچا دے گا اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ چنیسر کو جب یہ پیغام پہنچا تو اس نے صاف صاف انکار کر دیا اور کہنے لگا میرے لئے لیلاں کی محبت ہی کافی ہے ان سے کہہ دو فوراً یہاں سے چلی جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی موجودگی میں لیلاں کے دل میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے۔

چنیسر کا یہ جواب کونرو کے قافلے میں پہنچا تو دونوں ماں بیٹی بہت مایوس ہوئیں، واپس لوٹ جانا باعث ذلت سمجھا اس لئے پورے قافلے کو واپس بھیج کر خود فقیروں کے لباس میں چنیسر کی راجدھانی دیول کوٹ میں رہنے لگیں۔

آخر ایک روز نوکری کا بہانہ کر کے لیلاں کے محل میں پہنچیں اور نہایت عجز و انکسار اور آہ و زاری سے لیلاں کو اپنی غربت اور مفلسی کا احساس دلایا لیلاں ایک رحم دل عورت تھی۔ اس کو ان کے حال زار پر رحم آگیا اور انہیں اپنی کنیزوں میں شامل کر لیا۔ کونرو کو چنیسر کے بستر بچھانے کا کام سپرد کیا گیا اور اس کی ماں چنیسر کے کپڑے بننے اور سینے پرونے کا کام سرانجام دینے لگی۔

مدت گزر گئی لیکن کونرو کے دل کی بات دل ہی میں رہی اور اسے اپنے مقصد کا موتی ہاتھ آنا بہت مشکل نظر آنے لگا۔ عشق کی خاموش آگ نے اسے جلا کر بھسم کر دیا۔ انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے لیکن یہاں تو امید کی کوئی جھلک ہی نظر نہیں آتی تھی اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ آخر ایک رات چنیسر کا بستر بچھاتے ہوئے اس کے دل پر غموں کے بادل امڈ آئے اور اس نے آنسو بہانا شروع کئے۔ اچانک لیلاں وہاں آ پہنچی اور کونرو کو روتا ہوا دیکھ کر سبب دریافت کیا۔

کونرو نے بہانہ کیا کہ چراغ کے دھوئیں کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے لیکن لیلاں کو اس پر یقین نہ آیا۔ آخر کافی اصرار کے بعد کونرو نے کہا: مالکہ! اپنے

حال زار پر رو رہی ہوں۔ کوئی زمانہ تھا کہ میں بھی تمہاری طرح شاہی محل کی زینت تھی۔ یہاں تو تیل کے چراغ جلتے ہیں لیکن میرے پاس کچھ ایسے ہیرے تھے کہ رات کے وقت باہر نکالنے پر پورے محل کو بقعۂ نور بنا دیتے تھے۔ بس! آج ان ایام گذشتہ کی یاد ستا رہی ہے اور یاد کر کے رو رہی ہوں۔ لیلاں کو اس پر بھی یقین نہ آیا۔ جس پر کونرو نے اپنی ڈبیہ میں سے ہیروں کا ایک ہار نکالا جو اس نے بڑی احتیاط سے چھپا رکھا تھا۔ اس کے ہیروں کی آب و تاب واقعی ایسی تھی کہ پورا کمرہ جگمگا اُٹھا۔ لیلاں ہار دیکھ کر لالچ میں آگئی کیونکہ اسے ہیروں کے ہار سے بے حد محبت تھی اس نے کونرو سے کہا مانگ کیا مانگتی ہے جو مانگے گی وہ ہی پائے گی۔ صرف یہ ہار مجھے دیدے۔ کونرو نے پہلے تو لیلاں سے پکا وعدہ لیا اور پھر کہنے لگی کہ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے، صرف ایک رات کے لئے چنیسر کو میرے حوالے کر دو، پھر یہ ہار تمہارا ہی ہے۔ لیلاں سوچ بچار میں پڑ گئی اور ہیروں کی چمک کے سامنے چنیسر کی محبت اسے بالکل معمولی نظر آنے لگی۔ اس نے کونرو سے وعدہ کیا اور ہار لے کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔

رات کو چنیسر اپنے احباب کی محفل میں کافی دیر مصروف ناؤ نوش رہا اور شدید نشے کی حالت میں وہاں سے لوٹا تو لیلاں نے موقع غنیمت جان کر کونرو کو چنیسر کے کمرے میں پہنچا دیا۔ کونرو نے نکاح کا انتظام پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔ فوراً نکاح پڑھایا گیا اور چنیسر سے ایک دستاویز پر دستخط لے لئے گئے۔ چنیسر رات بھر مدہوش رہا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اپنی تمام کائنات کو دگرگوں پایا۔ دیکھا کونرو اس کے پہلو میں لیٹی ہوئی ہے اور لیلاں کا کوئی پتہ نہیں۔ بے حد پریشان ہو کر گھر سے باہر نکلا۔

بس اس وقت سے لیلاں کا زوال شروع ہو گیا اس نے تو صرف ایک رات کا سودا کیا تھا لیکن یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اس کی محبت اور راحت کا سارا قافلہ رات بھر میں لٹ جائے گا۔ چنیسر نے ناراض ہو کر لیلاں کو شاہی محل سے رخصت کیا اور وہ اپنے ماں باپ کے گھر جا کر ہجر و فراق کے عالم میں زندگی کے دن بسر کرنے لگی۔

مدت گزر گئی چنیسر نے تو لیلاں کو اپنے دل سے بھلا دیا۔ لیکن لیلاں اسے دم بھر کے لئے نہ بھُلا سکی۔ دن کو آہیں بھرنا اور رات کو تارے گننا، یہ اس کی زندگی کا معمول بن گیا۔ اتفاقاً چنیسر کا وزیر جکھرو لیلاں کے گاؤں آیا اور اپنے لئے اس گاؤں کی ایک لڑکی کا رشتہ اس کے ماں باپ سے طلب کیا۔ جب لیلاں کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے اپنے اثر و رسوخ سے یہ رشتہ منظور کروا دیا اور اس سے یہ وعدہ لیا کہ وہ اپنی شادی کے موقع پر چنیسر کو بھی اپنے ساتھ لائے گا۔ چنانچہ جکھرو اپنے وعدہ کے مطابق اپنی شادی کی مقررہ تاریخ پر چنیسر کو بھی بڑی منت و سماجت کے ساتھ اپنے ساتھ لے آیا۔

لیلاں برقع اوڑھ کر کسی نہ کسی حیلے بہانے سے چنیسر کے پاس آ پہنچی۔ چنیسر اسے بالکل نہ پہچان سکا البتہ اس کی دلفریب باتوں اور آواز کی دلکشی پر ضرور دیوانہ ہو گیا۔ چنیسر کی بے قراری جب حد سے بڑھ گئی تو لیلاں نے اپنے چہرہ سے برقع اٹھا دیا۔ چنیسر کی نظر جب لیلاں کے رُخ پر پڑی اور آنکھیں چار ہوئیں تو اسے اپنی بھولی ہوئی محبت یاد آ گئی اور بے اختیار غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔

کہتے ہیں چنیسر نے گرتے ہی اپنی جان خدا کے حوالے کر دی۔ لیلاں جو اس کے ہجر و فراق میں پہلے ہی سے موت کے مناظر دیکھ چکی تھی اس نے بھی چنیسر کے پہلو میں وہیں دم توڑ دیا اور دونوں کی بچھڑی ہوئی روحیں آپس میں مل کر ہمیشہ کے لئے ایک ہو گئیں +

سُرلیلاں چنیسر

شاہ عبد اللطیف بھٹائی رحہ
مترجمہ: ابن انشاء

لیلاں:۔ تو نے کیوں محو کیا ہے انہیں لوحِ دل سے
حاصلِ زیست سمجھتے ہیں جو پیارے تجھ کو
اے مرے دسترو کنور! میرے چنیسر راجا
دل مرا آج بھی رو رو کے پکارے تجھ کو
ان کے زخموں پہ مدھر بولوں کا مرہم رکھنا
اب بھی اپنا جو سمجھتے ہیں بچارے تجھ کو
ان کو خلقت کی نگاہوں میں نہ رسوا کرنا
واسطہ دیتی ہوں جینے کے سہارے تجھ کو
میں تری پیت کی ماری ہوں بچاری ابلا
کچھ خیال آتا ہے اس بات کا بارے تجھ کو
تیری سورانیاں، تو میرا اکیلا پیتم
دل بسارے تو بھلا کیسے بسارے تجھ کو
سیند:۔ ایک ادنیٰ سا گلوبند تھا جس کی خاطر
کھو دیا دل کے خداوند کو ناداں تو نے

تجھ سے سرگشتہ ہوا تیرا چنیسر راجا
کیٹی کو نرو سے کیا ایک جو پیماں تونے
اپنی قسمت کا عجب الٹا ہے صفحہ غافل
بات کی ہے بڑی رسوائی کے شایاں تونے
چل گیا ادنیٰ سے زیور کی ڈلک کا جادو
جانے کیا سمجھا تھا چاہت کو مری جاں تونے

لیلاں:۔ میں یہ سمجھی تھی کہ یہ ہار مرصع رتنار
ہاتھ آئے تو مرا روپ سوایا ہوگا
یہ نہ سمجھی تھی کہ یہ ہار ہے ظالم بَری
کیٹی کو نرو نے کوئی جال بچھایا ہوگا

سید:۔ چل ذرا ڈال کے اب اپنے گلے میں پلّو
ڈھونڈھ اس چیز کو جو کھوئی ہے لیلاں تونے
شاید اب تجھ سے بنالے، تجھے پھر اپنا لے
عذر اس سے جو کیا عاجز و گریاں تونے
پھر بھی مقصودِ مبارک نہ جو دل کا پایا
درگہِ یار سے محبوب بہ حیراں تونے
یونہی فریاد کناں عفو کی طالب رہنا
ہاں جو چھوڑا کہیں امید کا داماں تونے
ایک لغزش سے گنوایا، نہ گنوایا ہوتا
اپنے محبوب کا الطافِ فراواں تونے
رکھنا فریاد و فغاں اب بھی وظیفہ اپنا
زیست کرنی ہے اگر زود پشیماں تونے

لیلاں:۔ گُن جو ہیں ایک زمانے کے گُن داتے تم نے
تم سمجھتے ہو کہ مجھ میں کوئی خوبی ہی نہ تھی
اپنی بخشش سے نوازو مجھے پیتم پیارے
کیوں کوئی اور بنے دل کی تمہارے رانی
میں نے سوچا ہے، بہت سوچا، یہ آخر پایا
دہر میں سوختہ جانوں کا مقدر ہے یہی
جس پہ غصے کی نگہ ہو تری پیتم پیارے
باندی بن جائے جو رانی ہو چہیتی رانی

(۲)

لیلاں:۔ آج میں در پہ ترے آئی ہوں دلبر پیارے
اپنا اک عمر کا سرمایۂ عصیاں لے کر
تو جو آزردہ ہے کیوں آؤں میں در پہ تیرے
دلِ آشفتہ و مجبور و پریشاں لے کر

★

نوری جام تماچی

انور سعید گیلانی

جام جونو، ٹھٹھہ میں اپنے تخت پر بیٹھا امیروں وزیروں سے گفتگو کر رہا تھا کہ ہم نے شاہی خاندان کے تمام افراد کو کچل کر رکھ دیا ہے لیکن جب تک جام تماچی زندہ ہے تب تک ہماری حکومت ہرگز نہیں جم سکے گی۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ یہاں کا مشہور ولی شیخ حماد جمالی، جس کا سارے سندھ پر کافی اثر و رسوخ ہے، جام تماچی کا حامی ہے اور ممکن ہے وہ کسی بھی دن ہمیں تخت سے اتار کر اُسے بادشاہ بنا دے۔

جام جونو نے اپنے درباریوں سے صلاح مشورہ کرنے اور جام تماچی پر غالب آنے کے منصوبے بنا کر دربار برخاست کر دیا۔

ادھر شیخ حماد جمالی اپنے حجرہ میں چٹائی پر بیٹھا تھا، ننگے سر، ننگے پاؤں، بڑے بڑے بال، موٹا کپڑا اور تہہ بند پہنے۔ مریدوں اور فقیروں کا گروہ بڑی عقیدت کے ساتھ دوزانو اس کے سامنے بیٹھا ہوا۔ جام تماچی کی ماں نے شیخ سے اپنے بیٹے کے حق میں دعا چاہی اور شیخ نے اس کی درخواست قبول کی۔

گاؤں میں ایک مچھیرے کی لڑکی، نوری، کوڑھ کا شکار تھی۔ گاؤں والے اسے تنگ کر رہے تھے کہ وہ اُسے جام جونا کی سلطنت سے باہر لے جائے۔ کینجھر جھیل سے کہیں دور۔ ورنہ اسے سپاہیوں کے ذریعہ زبردستی باہر نکال دیا جائے گا۔ اتنے میں سچ مچ جام جونو

کے سپاہی ادھر آنکلے اور نوری کے ماں باپ کو قید کر کے لے گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ نوری کی وجہ سے سارے ملک میں بیماری پھیل جانے کا اندیشہ ہے، اسلئے اسے ایک گھنے سنسان جنگل میں پھینک دیا جائے۔ اور اس کے ماں باپ کو قید کر کے ٹھٹھہ پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ نوری کے ماں باپ چلاتے ہی رہے۔ لیکن سپاہی اسے بری طرح گھسیٹتے ہوئے جنگل میں پھینک آئے۔

اتفاق سے جام تماچی اور اس کے ساتھی بھی وہاں آنکلے۔ اُن کی سپاہیوں سے لڑائی ہوئی اور جام تماچی نوری کو اٹھا کر اسکے ماں باپ کے ساتھ واپس روانہ ہوگیا۔

جام تماچی کی دو بیویاں تھیں۔ وہ نوری کو دیکھ کر سخت نفرت کرنے لگیں اور خوب لڑتی جھگڑتیں۔ تماچی کی ماں نے بیٹے کو مشورہ دیا کہ اس لڑکی کو اپنے مرشد شیخ حماد جمالی کے پاس مکلی لے چلو۔ شاید اس کی دعا سے اچھی ہو جائے۔

جام جونا کے سپاہی چلاتے ہوئے اس کے پاس پہنچے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ جام جونا نے غصہ میں آکر کہا کہ یہ سرکش ضرور اپنے مرشد، شیخ حماد کے پاس گیا ہوگا۔ اس لئے جلدی چلو ہم اس ناہنجار اور اس کے مرشد دونوں کا خاتمہ کر دیں۔

جام تماچی اور اس کی ماں نوری کے ساتھ مکلی روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچے تو شیخ حماد نے دور ہی سے دیکھ کر کہا "بیٹی ہمیں تمہارے متعلق پہلے ہی سے معلوم ہو چکا ہے۔ فوراً اس خانقاہ کے پیچھے چلی جاؤ۔ وہاں ایک چشمہ ہے۔ اللہ کا نام لے کر اس میں نہاؤ اور پھر قدرت کا تماشہ دیکھو۔ نوری جوں جوں اس چشمہ میں نہاتی گئی اس کا کوڑھ دور ہوتا گیا اور اس کا جسم نکھرتا چلا گیا۔

شیخ حماد مراقبے میں چلے گئے تھے۔ انہوں نے یکایک مراقبہ سے سر اٹھایا اور کہا: "بیٹو! ظالم جونا ہم سب کو ختم کرنے آرہا ہے۔ لیکن وہ تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر وہ پھر مراقبے میں چلے گئے۔

جام جونا طوفان کی طرح گرجتا کڑکتا شیخ پر نازل ہوا۔ اور کہا تم فقیروں کو حکومت

کے معاملات سے کیا واسطہ؟ ادھر رعایا اور کچھ امرا نے جام جونا کے خلاف بغاوت کر دی کہ اس نے شیخ حماد پر حملہ کیا ہے۔ وہ جام تماچی کے بیٹے جام صلاح الدین کی قیادت میں جلدی جلدی روانہ ہوئے تاکہ جام جونا کو تخت سے اتار کر جام تماچی کو بادشاہ بنائیں۔

ابھی جام جونا کے منہ سے وہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ نوری جو اب سچ مچ حور بن چکی تھی، صحن میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی جام کا غصّہ کافور ہو گیا اور وہ گھور گھور کر نوری کو دیکھنے لگا۔ جام تماچی بھی اس کے تیرِ حسن کا زخمی بن کر رہ گیا۔

جب شیخ حماد مراقبے سے اٹھا تو اس نے کہا ہم فقیر جسے چاہیں بادشاہ بنائیں۔ چونکہ تم ہمارے دروازے پر آئے ہو، اسلئے تمہیں کچھ دیر اور حکومت کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ یہ وقت میرے چہیتے مرید کی آزمائش کا وقت ہوگا۔

اتنے میں لوگ اور امیر "جام تماچی زندہ باد" کے نعرے لگاتے داخل ہوئے۔ جام جونو موقع پاکر کھسک گیا۔ جام صلاح الدین کے ہاتھ تاج آگیا جو اس نے شیخ حماد کے قدموں میں ڈال دیا۔ اور کہا یہ تاج جس کو جی چاہے دیدو۔ شیخ حماد نے وہ تاج اپنے ہاتھوں سے اٹھاکر جام تماچی کے سر پر رکھ دیا۔ لوگ جام تماچی کو لے کر چلے گئے۔ اور نوری اور اس کے ماں باپ شیخ کے پاس رہ گئے۔ شیخ نے نوری کو دعا دیتے ہوئے کہا: جاؤ اپنے گاؤں ہِلایا میں جھیل کینجھر کے کنارے کسی کی آمد کا انتظار کرو۔

جام تماچی نے تخت پر بیٹھتے ہی اعلان کیا کہ آج سے امیر غریب سب برابر ہیں اور ہر کہیں انصاف ہی کا دور دورہ ہوگا۔ گھر آکر جام تماچی نے دل میں کچھ بے چینی محسوس کی۔ خبر نہیں کیوں؛ اس کی دونوں بیویاں آئیں اور پوچھنے لگیں اب ہم میں سے ملکہ کون ہوگی۔ جام تماچی نے جواب دیا جو بھی ایک خاص امتحان میں کامیاب ہوگی وہی ملکہ بنے گی۔ جام تماچی اپنے مرشد کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہونے ہی کو تھا کہ خبر آئی جام جونو اور اس کے ساتھیوں نے سونڈا شہر میں جاکر بغاوت پھیلا دی۔ جام تماچی صلاح الدین کو حکومت سونپ کر باغیوں کی سرکوبی کو روانہ ہو گیا۔ اور انہیں شکست فاش دی۔ جام تماچی شہر میں گھوم پھر کر رعایا

کے ہر ایک آدمی سے مل کے بات چیت کر رہا تھا کہ اس کی نظر جھونپڑی میں ایک کوڑھ کی ماری بڑھیا پر پڑی جس سے اسے نوری یاد آگئی۔ اور وہ ہلایا روانہ ہو گیا۔ اگرچہ نئی نئی حکومت ہونے کی وجہ سے ہر طرف سخت شدید خطرات کا سامنا تھا۔

نوری ایک کشتی میں سوار گا نا گا رہی تھی اور جام تماچی کنارہ پر ٹہل رہا تھا۔ نوری اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ اور اسے مہمان کی حیثیت سے اپنے گھر لے گئی۔ جام تماچی نے اس کے باپ سے اس کا رشتہ مانگا اور وہ رضامند ہو گیا۔ دونوں کی شادی ہو گئی۔

تماچی نے نوری کے لئے دریا میں ایک شاندار محل بنایا۔ تماچی ان کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر جال لئے مچھلیاں پکڑتا۔ تماچی نے نوری کے باپ کو بلایا قوم کا چودھری بنا دیا، جھیل کینجھر اس کی جاگیر قرار دی اور سب سرکاری محصول معاف کر دئے۔ تماچی نے نوری کے باپ کو وزیر اعظم اور اسے ملکہ بنانا چاہا۔ مگر نوری نے کہا وہ دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈالنا نہیں چاہتی۔

جب جام تماچی کی بیویوں کو سارا حال معلوم ہوا تو انہوں نے سازش کی کہ کسی طرح نوری کو ٹھٹھہ بلایا جائے اور میٹھی میٹھی باتوں میں اسے زہر دے کر ختم کر دیا جائے۔ تماچی کی ماں نے اسے یاد دلایا کہ وہ اپنے مرشد کو بھول گیا۔ اور وہ فوراً اس کی خدمت میں نذرانہ پیش کرنے چل پڑا۔

جام جونو آخری داؤ کھیلنے کے لئے سلطان علاؤالدین خلجی کا لشکر ساتھ لے کر ٹھٹھہ کی طرف بڑھا۔ تماچی معاملات صلاح الدین کو سپرد کر کے محلسرائے چلا گیا۔ یہاں اس کی دونوں بیویاں نوری کو مارنے کا منصوبہ کئے بیٹھی تھیں۔ ایک نے تماچی کے بالوں کی ایک لٹ پلنگ کے ایک پائے سے باندھ دی اور دوسری نے دوسرے پائے سے۔ چھوٹی بیگم نے نوری کی صراحی میں زہر ڈال دیا۔ وہ رات کو پانی پینے چلی ہی تھی کہ آواز سنائی دی جام جونو سلطان علاؤالدین خلجی کے لشکر کے ساتھ آپہنچا۔ اور اس نے صلاح الدین کو گرفتار کر لیا۔ دوڑو دوڑو۔ جام تماچی کو بچاؤ۔ پانی کا برتن نوری کے ہاتھ سے نیچے گر پڑا۔

جس سے جام تماچی کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے بال پلنگ سے بندھے تھے اسلئے وہ اٹھ نہ سکا۔ اتنے میں جام جونو وہاں پہنچ گیا اور جام تماچی، نوری اور محل کے دوسرے سب لوگوں کو گرفتار کرلیا۔ جام جونو نے حکم دیا کہ باغی جام تماچی اور صلاح الدین کو سلطان علاء الدین کے فرمان کے مطابق دہلی بھیج دیا جائے۔ اس حور صفت لڑکی نوری کو ہم اپنی حفاظت میں رکھیں گے اور اسے اپنے محل کی زینت بنائیں گے۔ جام تماچی کی ماں شیخ حماد کی خدمت میں پہنچی کہ اس بزرگ کی دعا سے ان کی بگڑی پھر بن جائے۔

جام جونو نے نوری پر بہتیرا دباؤ ڈالا مگر بے سود۔ آخر اسے زنجیروں سے جکڑ کر قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ ادھر جام تماچی اور صلاح الدین بھی دہلی کے قید خانہ میں بند کردئے گئے۔

جام جونو تخت پر بیٹھا تھا کہ سات درویشوں نے باریاب ہوکر کہا حضور کلاکوٹ مکلی کے قلعہ میں ایک زبردست اژدہا ہے جس کا سر مکلی میں ہے اور دھڑ ہندوستان میں۔ جب تک اس کا سر مکلی میں ہے تب تک سمہ خاندان سے کوئی حکومت نہیں چھین سکتا۔ جونو نے کہا تو پھر جہاں سانپ کا سر ہے وہاں کیل گاڑ کر سانپ کا سر مضبوطی سے پکڑ لیا جائے۔ تب حکومت ہمارے ہاتھ ہی میں رہے گی۔ درویشوں نے کہا سانپ نے اپنا سر پھیر کر دتی جانا شروع کر دیا ہے۔ اسلئے ہم بے بس ہیں۔ جونو نے اس حکم عدولی پر ان کا ایک ایک کر کے سر کٹوا دیا۔ اور وہ پیشگوئیاں کرتے ہوئے جاں بحق تسلیم ہوئے۔

آخر شیخ حماد کی دعا سے سموں کے دن پھرے۔ دہلی میں شیخ حماد کی شکل کا کوئی بزرگ قید خانہ میں داخل ہوا اور اس نے باپ بیٹے کو رہا کردیا۔ اسی طرح اس بزرگ نے نوری کو بھی رہائی دلائی۔ اور وہ مکلی جا پہنچا۔ بزرگ نے جام تماچی کے حامیوں کو بھی دہلی سے باہر تیز گھوڑوں پر سوار کیا اور کہا کہ جلدی سندھ پہنچو۔ حکومت تمہارا انتظار کر رہی ہے جام تماچی نے نوری کو کہا آج فتح ہماری ہی ہوگی اور ہم تمہیں اپنی سب سے بڑی ملکہ انتخاب کریں گے۔ چنانچہ فتح تماچی ہی کی ہوئی۔ جونا کی فوج نے مقابلہ کئے بغیر اطاعت قبول کی اور

جام جونا قتل ہوا۔

جام تماچی نے ٹھٹھہ کے تخت پر بیٹھ کر اعلان کیا کہ اب ہم غیروں کے غلام نہیں رہے اور ہر طرح آزاد ہیں۔ جام تماچی محل کے اندر داخل ہوا اور اس کی دونوں بیویاں سب سے بڑی ملکہ بننے کی تمنا میں خوب بن سنور کر آگے بڑھیں اور بے حد خوشامد کرنے لگیں۔ تماچی نے کہا نوری کہاں ہے؟ اور جھٹ اس کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ایک کونے میں اپنا شادی سے پہلے والا مچھیرن کا لباس پہنے اداس بیٹھی تھی۔ تماچی نے اس کا سبب پوچھا۔ نوری نے جواب دیا میں تو ایک ادنی مچھیرن ہوں۔ میں یہ جرأت کیسے کرتی؟ تماچی نے خوش ہو کر نوری کو اپنے گلے سے لگا لیا اور کہا "بس آج سے تم میری ہی سب سے بڑی ملکہ ہو اور ہم تمہیں ملکہ معظمہ کا لقب عطا کرتے ہیں۔ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے اور دوسری بیگمات منہ دیکھتی رہ گئیں ○

سُر کاموڈ

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

مترجمہ: عاصمہ حسین

شاہ بھٹائیؒ کے فکری مرکز و محور دو ہیں: الٰہ و عبد، حق و روح، جن کا آپس میں بنیادی تعلق ہے۔ لہٰذا وہ الوہیت کے ساتھ "روح" کے شاعر بھی ہیں اور ان کا کلام روح کی بلندی و پستی، فتح و شکست، عروج و زوال کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ ان کی ہیروئینیں۔ سوہنی، سستی، ماروی اور نوری بنیادی کیفیتوں اور اقداروں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ نوری کیا ہے؟ انسانی فطرت، اپنی تمام کمزوریوں اور سفلی رجحانات کے ساتھ۔ اسے درجہ بلند حاصل کرنے کے لئے جام تماچی کی ضرورت ہے۔ وہ ہستی جو انسان کو پستی سے بلندی کی طرف جانے کی تحریک دلاتی ہے نظم کے بغیر مطالعہ سے جام کی علاماتی حیثیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ نوری پہلے گندری[1] ہے اور پھر نوری۔ اسی لئے اس کی ذات میں وہ ڈرامائی دلچسپی اور کشش نہیں جو سوہنی، سستی اور ماروی میں ہے یا ان سے متعلق سُروں میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ موضوع کی نوعیت کلام پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ تاہم بھٹائیؒ کے بنیادی تصور کو واضح کرنے کے لئے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ ہیروئینوں کے نام بھی اسی لئے نسوانی ہیں کہ وہ 'روح' کی تمثیل ہیں۔

---

[1] سندھ کے مچھیروں کا ایک قبیلہ جو گندری کہلاتا ہے۔ نوری کو بدترین انسانی مرض، کوڑھ کا شکار بتایا گیا ہے۔

تو سمّہ ہے میں گندری
تو اوج سراپا میں پستی
مرا دل ہے گناہوں کی بستی
کہیں دیکھ کے سج دھج رانیوں کی
اور ان کا سحر بھرا جوبن
مجھے چھوڑ نہ دینا اے ساجن
منہ موڑ نہ لینا اے راجن

(۲)

تو سمّہ ہے میں گندری
مرے دل میں ہیں عیب ہی عیب بھرے
مرے تن پر مچھلی کے ریشے
کہیں دیکھ کے یہ اوگن میرے
جن سے ہے بھرا میرا تن من
مجھے چھوڑ نہ دینا اے ساجن
منہ موڑ نہ لینا اے راجن!

(۳)

تو سمّہ ہے میں گندری
ہیں مجھ میں کروڑوں عیب نہاں
مرے تن پر یہ مچھلی کے نشاں
یہ بُو کہ ہوں برگشتہ دل و جاں
ہاں دیکھو ان ہی کے کارن
مجھے چھوڑ نہ دینا اے ساجن!
منہ موڑ نہ لینا اے راجن!

(۴)

تو سمّہ ہے میں گندری
عیبوں کا پُتلا من میرا!
تن میرا مچھیروں کا پالا
میں کیا ہوں مری اوقات ہے کیا
میں ممی[1] تو جام، برائے خدا
کہیں بھول کے یہ بھرپور لگن
مجھے چھوڑ نہ دینا اے ساجن!
منہ موڑنا لینا اے راجن!

(۵)

تو سمّہ ہے میں گندری
مجھ میں ہے ہزار اک عیب بھرا
معلوم ہے تجھ کو حال مرا
ہاں بہر خدا اے بے ہمتا
باندھا ہے جس نے یہ بندھن
مجھے چھوڑنا نہ دینا اے ساجن!
منہ موڑنا لینا اے راجن!

(۶)

تو مالک ہے اس بستی کا
ہم بستے ہیں تیرے سائے میں

۱۔ کنول گٹہ

میں ایک مچھیرن بے مایہ
مت دیجیو داغ جدائی کا
ترے نام سے میری آن بجا
تو مان ھے میری پستی کا

(۷)

تو جام ھے سب پورا ج ترا
دریائی بستی سب تیری
میں غربت کی گودی میں پلی
تو اپنا ہے، اس کارن ہی
کر ہم کو معاف لگان سبھی
گو سب پہ ھے واجب باج ترا

(۸)

یہ رشتہ کن سے جوڑ لیا
جن میں نہیں کوئی تاب و تواں
ہیں مچھلیاں کھانے کا ساماں
یہ ڈھیر ہی ڈھیر عفونت کے
انبار ہیں ان کی دولت کے
سب پھرتے ہیں مارے مارے
تجھ سے ہی امید رکھیں سارے
ھے جام! سہارا تو ان کا

(۹)

یہ آتے ھیں بھاری جال لئے
یہ کشتیاں برگ و سازان کا
اور لوٹ کر و ل پر ہے نازان کا
جب پھیلیں سورج کی کرنیں
دربار میں حاضر ہو جائیں
سمہ نے خویش بنایا انھیں
نوری کی اتھاہ محبت میں
جو لوگ غریب مچھیرے ہیں
اور ذات قبیلے مَی کے ہیں
غربت میں سدا اک حال لئے

(۱۰)

بل بوئیں بسی پیروں میں
اور چھاج بھی سارے آلودہ
ہر تنکے میں مچھلی کا ریشہ
سمہ سے ہے کہ ان لوگوں میں کھڑا
دن رات کرے کیا کچھ نہ دیا
کھویا ھے انھی ھنگاموں میں

(۱۱)

وہ کالی بھونڈی بد صورت
بے ہنگم بھدی ناریاں ہیں
لئے بیٹھی اپنی پٹاریاں ہیں
ہو کون بھلا غمخوار اُن کا؟

ہے جاتم پہ دارومدار ان کا
وہ اُن کے لئے عینِ رحمت

(۱۲)

یہ جال، پٹارے چھاج اُن کے
مچھلی کو دل وجاں سے چاہیں
دریا کے کنارے بیٹھیں اُٹھیں
مچھلی کی بو سے، بسے ہوئے
نت اُن کی بساند میں کھوئے ہوئے
سیّد کہے: مچھووں کی صورت
ان لوگوں کو پانی سے الفت
ان ماجھیوں ہی کی دل جوئی
سمے نے اپنے ذمے لی
ہے ٹھیک اسی سے کاج اُن کے

(۱۳)

وہ گھاس کہ جس سے کِھس آئے
چھٹی ہوئی ان کے لہنگوں سے
تن ڈھانپیں پھول پبوڑے کے
لو، راجہ ان کے جھونپڑوں میں
کس شوق سے آئیں، دیا کریں
جو دیکھے اُن کا جس گائے

(۱۴)

ہے گندی سی گھاس اُن لہنگوں میں
اور تن پہ پھول پبوڑے کے
یہ پھول ہی انگ سدا ڈھانپے
سب جھیل بیٹی اُن لوگوں میں

(۱۵)

خوش ہو کو جاتم کی آمد پر
سب ناریاں شوقِ سلام لئے
شکرانہ تو ہر گام لئے
لہنگوں پہ گھاس ہی گھاس جمی
اور سروں پہ گٹھری پہ گٹھری
اُٹھ کو تیار ہوئیں گھر گھر

(۱۶)

گھل مل گئے جاتم سے وہ سارے
ہر ایک مچھیرن چھوٹی بڑی
اونچے محلوں میں رہنے لگی
اک کینجھر جھیل کی بات ہی کیا
ہر ماجھی روم کے ساگر کا
خورشید فلک سے سہارے

(۱۷)

نوری، اس کی دنیا بدل لی
نہ وہ مچھلیاں پکڑے نہ پاس رکھے
نہ وہ مچھلیاں کاٹے نہ بیچے
سب توڑ کے کنوئیں میں پھینک دیئے

ہنت پیار کی نظروں سے دیکھے
کس کو اپنے من راجن کو
اُس پریت کے رسیا ساجن کو
وہی رنگ اُس کا وہی ریت اُس کی
سمہ کے راج محل والی
اب اُس کی شان ھی اور ہوتی

(۱۸)

نوری کے دل میں شوق اٹھا
اک پھول پیوڑے کا توڑا!!
اور بڑھ کر جام کی نذر کیا
سمے کے محل کی سب ناریں
گم ہو گئیں عالمِ حیرت میں
اور جام کا دل یوں لوٹ آیا
اک مہر کا دریا پھوٹ پڑا
کچھ نرمی سے کچھ الفت سے
ہاتھ اپنا بڑھایا شفقت سے
اور ہاتھ پکڑ کر گندری کا
گاڑی میں بٹھا کر چلا گیا
وہ جام، وہ گندری، شانِ خدا

(۱۹)

کیا صورت میں کیا سیرت میں
وہ اور مچھیرن کیا کہنا
ہر رنگ میں وہ کچھ اور لگے
جس طرح ستار کے تاروں میں
ان دھیمی دھاروں میں
دھاگے کا اجلا روپ جگے
اندھیارے میں جیسے دھوپ لگے
یونہی نوری لگتی تھی رانیوں میں
نورانی فرشتہ ناریوں میں
فطرت ہی تھی اس کی شاہانہ
اونچا تھا نظر کا پیمانہ
جبھی جام نے اس کو جان لیا
اور باندھا کلائی میں ڈورا
یکسر سرشار محبت میں

(۲۰)

وہ روپ انوپ وہ آب اُس کی
جھیل اس کے سامنے پانی بھرے
کب حسن و جمال کی تاب رکھے
نے ڈھیر لگائے مچھلیوں کے
نے گندریوں کے سنگ بسے
وہ ڈونگے کشتیاں کھینے کی
سب محنت اس کو معاف ہوئی
خود مور چھل اس کو جام جھلے
اور شوق سے صبح و شام جھلے
ایسی تھی بلند جناب اُس کی

دانی

رہی مچھیرنوں میں وہ لیکن ڈال دیئے ہیروں پر ہاتھ
نوری پر تھی صرف نوازش جام تماچی کی دن رات
کیا کہنے ہیں اس کے کرم کے، احسانوں کی وہ برسات
اُس کا کارن؟ ترکِ غلاظت، اور وہ شوقِ عطریات

★

اندھوں لولوں لنگڑوں سب پر کیا سخاوت کا دروا
داد و دہش اس مردِ سخی کی، دیا دھڑا دھڑ مال لُٹا
ہر ہر رُت پر تحفے نئے ان ناچیزوں کو کیئے عطا
جوہری ہُن برسانے والا ہوا زمانے میں پیدا
مچھلی بیچنے والوں کو دئے لعل و گہر بے مول عطا

★

پہلے بانٹ دیں ساری مہریں نوری نے ناداروں میں
پھر یہی مشغلہ ڈھونڈا اس نے سب چاندی کے سکوں میں
پھر ذوقِ کرم مشغول ہوا انمول اور نادر چیزوں میں
فیروزے ہزاروں بخش کئے محتاجوں اور فقیروں میں
بے انت جواہر بکھرائے دھرتی کے کنونڈے باسیوں میں
سیّد کہے اس نے یہ کام کئے بیٹھے ہوئے اپنی مچھیرنوں میں

★

موہڑو میربحر

ممتاز احمد سومرو

کراچی کے ساحل پر اوبھا نامی ایک مچھیرے کے سات لڑکے تھے۔ جن میں سے موہڑو سب سے چھوٹا، پست قد اور لنگڑا تھا۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے چھ بھائی بڑے جسیم، بلند قد اور شہ زور تھے۔ وہ روزانہ سمندر سے مچھلی پکڑنے جایا کرتے اور اپنے اس اپاہج بھائی کو گھر کی حفاظت کے لئے چھوڑ جاتے۔

بلوچوں کے دودائی قبیلہ کی ایک عورت تھی جس کا نام کُلاچی تھا۔ اُس نے ان مچھیروں کی بستی کے قریب آکر اپنا گاؤں آباد کیا۔ کہتے ہیں یہ وہی چھوٹا سا گاؤں ہے جو آج کراچی کہلاتا ہے۔ کُلاچی سے کچھ دور یعنی موجودہ کلفٹن اور منوڑا کے درمیان سمندر میں ایک بڑا گہرا گرداب تھا جسے "کلاچی جو کُن" یعنی کلاچی کا گہرا گرداب کہا کرتے تھے۔ یہ گرداب بہت خطرناک تھا اور اُس میں کئی کشتیاں غرق ہو جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ اس میں ایک بڑا بھاری مگرمچھ بھی رہتا تھا اور جو بھی اُس کے سامنے آتا تھا اُسے فوراً ہڑپ کر لیتا تھا۔ اتفاقاً ایک روز موہڑو کے بھائی اُسی گرداب کے قریب آکر مچھلیاں پکڑنے لگے۔ دوسرے مچھیروں نے انہیں بہت سمجھایا کہ یہ گرداب بڑا خطرناک ہے۔ یہاں سے فوراً دور چلے جاؤ ورنہ جان کھو بیٹھو گے لیکن وہ باز نہ آئے اور بہت اطمینان سے مچھلیاں پکڑتے رہے۔ ایک دفعہ جب اُنھوں نے جال سمندر میں پھینکا اور اُسے باہر کھینچنے کے لئے آگے بڑھے تو گرداب بلا کی طرح اُن کی طرف اُمڈ آیا اور

ان سب کو کھینچ کر سمندر کی گہرائیوں میں لے گیا۔ ان کی کشتیاں سمندر میں غرق ہو گئیں اور یہ سب اُس ظالم مگرمچھ کے کام و دہان کا لقمہ بن گئے۔

گھر لوٹنے کا وقت ہوا۔ عزیزوں رشتہ داروں کو بڑی فکر ہوئی۔ مورڑو تلاش میں نکلا اور جائے واردات پر پہنچ کر ساری حقیقت معلوم کی۔ بہ صد افسوس بھائیوں کی جدائی کا داغ لے کر گھر واپس آیا۔ اس نے تمام رشتہ داروں کو جمع کیا اور مگرمچھ سے بدلہ لینے کے لئے منصوبہ تیار کیا۔

مورڑو کی تجویز کے مطابق لوہے کا ایک پنجرہ تیار کیا گیا جس کے ارد گرد لوہے کی تیز، دھاری دار سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور ہر سلاخ کے ساتھ لوہے کی ایک موٹی زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ یہ سب سامان ساتھ لے کر کلاچی کے سب مچھیرے گرداب تک آپہنچے لنگڑا مورڑو پنجرہ کے اندر ڈٹ کر بیٹھ گیا اور مچھیروں سے کہا اس پنجرہ کو گرداب میں پھینک دو اور جب زنجیریں ہلتی ہوئی دیکھو تو اُسے کھینچ کر فوراً باہر نکال لو پنجرہ کو دیکھتے ہی مگرمچھ نے زور سے اپنا منہ کھولا اس کی تیز سلاخیں اس کے منہ میں چبھ گئیں۔ اس نے ان سلاخوں کو باہر نکالنے کی بہتیری کوشش کی مگر وہ تیکھی تیکھی سلاخیں اس بُری طرح چبھ گئی تھیں کہ وہ بے بس ہو گیا مورڑو نے زنجیریں ہلائیں اور مچھیروں نے اُسے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ وہ لوگ کشتیاں دھکیل کر فوراً کنارے پر پہنچے، مگرمچھ کو مار ڈالا اور مورڑو کو صحیح سلامت پنجرے سے باہر نکال لیا۔ مورڑو نے مگرمچھ کا پیٹ چیرا اور اپنے بھائیوں کے ڈھانچے اُس میں سے نکال کر باہر رکھ دیئے پھر انہیں بڑی عزت و احترام کے ساتھ موجودہ کراچی سے شمال مغرب کی طرف پہاڑ کے دامن میں لا کر دفن کیا اور خود تمام عمر اُن کی قبروں پر مجاور بن کر گزاری۔ یہ قبرستان آج بھی "مورڑو میر بحر کا قبرستان" کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں کراچی کے مشہور جزیروں بابا، بھٹ، منوڑا وغیرہ کے مچھیرے اپنے لوگوں کی لاشیں آ کر دفن کرتے ہیں اور مورڑو کو ایک ولی اللہ کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں۔

بھٹائی گھوٹ

انور سعید گیلانی

کتنے ہی عاشقوں کی طرح جن کی محبت کی کہانیاں وادئ مہران کے ہردلعزیز عارف شاعر، شاہ عبداللطیف بھٹائی رح نے اپنے انداز میں پیش کی ہیں، ان کی اپنی کہانی بھی محبت ہی کی کہانی ہے جس کے پیچ و خم بہت ہی عجیب ہیں۔ ابتداء بھی اور انجام بھی۔ اس دلچسپ رومانوی کہانی کو جس کے تیور بعینہٖ عوامی کہانیوں کے ہیں۔ "بھٹائی گھوٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یعنی "بھٹ کا دولہا"۔ اس کی دلچسپی کے پیش نظر ہم اس کا خاکہ ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

مہران کے پیارے۔ بھٹ کے دولہا، شاہ لطیف کو کون نہیں جانتا؟ جسے اس دھرتی کا بچہ بچہ "لال لطیف" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ چھیتوں کا چھیتا، پہلے ایک سیّد گھرانے کا نور نظر اور اب ساری قوم کا چشم و چراغ: بھلا محمدؐ کی آل اور اس کی ہر کہیں عزت نہ ہو؟

اور پھر مہران کی وادی میں جسے کبھی سندھ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس لئے شاہ صاحب کا گھرانہ بھی بڑی ہی عزت و توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ خود تو کیا، لوگ تو ان کا سایہ بھی دیکھ لیتے تو اسے چوم چوم لیتے۔ "لال لطیف" کی طرح ان کے دادا بھی بہت بڑے بزرگ اور بڑے شاعر تھے۔ ان کا نام تھا شاہ عبدالکریم بُلڑی والے۔

باپ، شاہ حبیب، اپنے علاقے میں سادات کے سردار اور سربراہ۔ عام لوگ بھی جو یہیں کی مٹی سے اُگے، یہیں پھلے پھولے اور بڑے بڑے امراء و رؤسا بھی جو زیادہ تر باہر سے فاتح بن کر آئے تھے اور ہمیشہ کے لئے یہیں آباد ہو گئے، چھوٹے بڑے سبھی ایک جگہ رہتے تھے اور جیون ندی بھی اپنی پرانی چال کے ساتھ اونچی نیچی بہتی چلی جا رہی تھی۔

سادات کی برکت سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ ان کی دوا، ان کی دعا کے امیر غریب، چھوٹے بڑے سب قائل اور دل سے خواہاں۔ اس لئے جب کوئی بیمار پڑتا تو دم درود، دعا کے لئے سادات ہی کو یاد کیا جاتا اور کچھ عجب نہیں کہ اُن کی روحانیت کے فیض سے بیمار سنبھل جاتے اور مرنے والے بھی بستر سے اٹھ بیٹھتے۔

ایک ایسا ہی حسین اتفاق شاہ صاحب کی زندگی میں بھی پیدا ہو گیا۔ ترکوں کا ایک مشہور قبیلہ، ارغون ہے، جس کا ایران کی تاریخ میں بھی بڑا چرچا سنائی دیتا ہے۔ اس کی ایک شاخ تھی جو مرزا کہلاتی تھی۔ ان دنوں یہ اس علاقے میں نواب تھے۔ اور ہر جگہ ان ہی کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ لوگ کون تھے؟ چنگیز خاں جیسے نامی گرامی فاتح کی اولاد۔ خود بھی نہایت شجاع اور عالی دماغ۔ جیسا ہر عالی نسب عالی جاہ ہوا ہی کرتا ہے۔ ان کا کوٹ جو "کوٹری مغل" کہلاتا تھا کہیں اُس علاقے کے قریب ہی واقع تھا جہاں اُن کے روحانی مرشد شاہ عبدالکریم کا خاندان آباد تھا۔ مرزا مغل بیگ، خاندان مرزا کا ایک نہایت باوقار فرد اور رکنِ رکین تھا۔ اُس کی صاحبزادی۔ سیّدہ بیگم، شاید اس کا نام ہی اس کی خاندان سادات سے وابستگی کا پرتو لئے ہوئے تھا ــــ اتفاق سے بیمار پڑ گئی۔ اس لئے شاہ صاحب کے والد شاہ حبیب کو فوراً بلایا گیا کہ وہ اس کے لئے دعا کریں۔ وہ کچھ ایسے کام میں الجھے ہوئے تھے کہ ان کے لئے جانا محال تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی جگہ اپنے نورِ نظر لطیف کو بھیج دیا ــــ ایک نوخیز جوان جس کی رگ و پے میں جوانی کا گرم و تیز خون دوڑ رہا تھا۔ اب زندگی کا کھیل کہئے یا تقدیر، اسے خود ہی رومان کی راہ پر لے جا رہی تھی۔

عام دستور کے مطابق دیگر شرفا کی طرح خاندان مرزا میں بھی پردہ کا رواج تھا، اور بہت سخت۔ مگر جہاں روحانی پیشواؤں کی بات ہو وہاں پردہ کا کیا سوال! سادات معمر ہوں یا جوان، ان کی حیثیت تو بزرگوں کی سی تھی۔ اس لئے انہیں گھروں کے اندرونی حصہ میں جانے کی اجازت تھی۔ اتنا بڑا اعزاز صرف سادات ہی کو نصیب تھا بیگمات پردہ کے لئے چادر ہو، یا پھلاری سے اپنا بدن یا دوپٹے سے چہرہ ڈھانپ لیتیں مغل بیگ کی بیٹی، چندے آفتاب چندے ماہتاب، اپنے حسن وجمال کے لئے مشہور تھی۔ ادھر یہ پیکر حسن و زیبائی اور ادھر لطیف، ایک پیکر شباب! خبر نہیں قدرت کو آتش و خس کی اس یکجائی سے کیا منظور تھا۔ ان حالات میں جو کچھ ہو سکتا تھا وہی ہوا۔ لطیف سراپا شعلہ، سراپا ہیجان۔ اس حسن آتشیں کو دیکھ کر بھڑک اٹھا۔ اس نے اس نازک سیم تن لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس کی طبیعت قابو میں نہ رہی اور وہ بے اختیار بول اٹھا:

"جنهن جي آڱر سيد هٿ ۾ تنهن کي لهر نه کو لوڏو"

(جس کی انگلی سید کے ہاتھ میں ہو، اسے موج وتلاطم سے کیا خطرہ؟)

اب سندھی ہو یا ہمارے ہاں کی کوئی زبان، کسی لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لینے کے معنی ایک ہی ہیں۔ گویا وہ اس ہی کی ہو گئی۔ کوئی اس سے بڑی بات بھلا اور کیا کہہ سکتا؟ اور پھر مرزا —— ان کا خاص خاندانِ گرامی۔ بھلا وہ ایسی بات پر کیوں نہ تلملا اٹھتے۔ مگر وہ ساتھ ہی بڑے خلیق بھی تو تھے اور سمجھدار بھی۔ انہوں نے دل میں کہا۔ اس وقت کچھ کہنا ٹھیک نہیں۔ یونہی بدنامی ہو گی۔ پھر دیکھا جائے گا، مگر یہ توہین ان کے دل میں برابر کھٹکتی رہی کہ ایک معمولی سید زادہ۔ چنگیز خاں کے عظیم الشان خانوادہ کی لڑکی کے بارے میں ایسی جرأت کرے۔ ان کی غیرت اس بات کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کہاں تو اس خاندان کے لوگ سادات کی بڑی

تعظیم کرتے تھے اور یہاں برا بری طرح پیش آنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے ایماسے مرزا ہی نہیں بلکہ عام لوگ بھی ان کی کھلم کھلا بے عزتی کرنے لگے۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ کوئی سید بھی مرزاؤں کے گھر کے پاس سے اپنی توہین کرائے بغیر نہ گزر سکتا اور بیچارے سیدوں کو بالآخر اس جگہ کو چھوڑتے ہی بنی۔ عافیت سے رہنے کے لئے یہی بہتر تھا کہ وہ اس مقام کو چھوڑ کر تھوڑا ہی دور اور شمال کی طرف آباد ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لئے ایک اور ڈیرہ بنالیا۔

بیچارہ لطیف۔ اس وقت اس کی عمر کل بیس سال تھی۔ اُدھر اسے عشق نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ بلا کا حساس، محبت کا کھولتا ہوا۔ جوالا مُکھی۔ مگر اس کی بے چین طبیعت میں ایک بے پناہ ہیجان، ایک زبردست آشفتگی پیدا ہوئی۔ وہ کئی کئی دن ارد گرد کے صحرائی علاقوں اور ویران بیابانوں میں اپنے حسین چہرے پر کرب و اضطراب، اداسی اور حرمان نصیبی کی علامات لئے گھومتا پھرتا رہا۔ آخر دل کی لگی کسی طرح تو چین پاتی۔ یہ آگ کسی طرح تو بجھتی۔ اسی لئے دل کی لگی کو بجھانے کے لئے اس نے طرح طرح کے شعر کہنے شروع کئے۔ جن میں کی اپنے دل کی رانی کا کبھی سورج کبھی چاند اور کبھی ستاروں سے مقابلہ کرتا اور ظاہر ہے جیت کس کی ہوتی۔

ہوتے ہوتے اس شوریدگیٔ دل نے ایسا رنگ اختیار کیا کہ وہ صحرا میں بیٹھے بیٹھے غش کھا جاتا۔ کہتے ہیں ایک دفعہ وہ اتنی دیر بیہوش رہا۔ کہ آندھی سے ریت اڑ اڑ کر اس کے اوپر پڑتی رہی اور وہ تقریباً اس کے نیچے دب گیا۔ خوش قسمتی سے اس کے والد بر وقت پہنچ گئے اور انہوں نے اس کو بچالیا۔

بعض اوقات جذبے کی شدت اس حد تک بڑھ جاتی کہ وہ بالکل یاس کا شکار بن جاتا۔ ایک دن لطیف حسب معمول ایسے گئے کہ واپس نہیں لوٹے۔ لوگ ادھر ادھر تلاش میں دوڑے مگر ان کا کہیں بھی پتہ نہ چلا۔ بعد میں معلوم

ہوا کہ گانے والے بنجاروں کی کوئی ٹولی آئی تھی۔ شاہ صاحب انہی جیسے جوگیا کپڑے پہن کر ان کے ساتھ نکل گئے۔

اسی طرح شاہ صاحب کی زندگی میں ایک نیا دور شروع ہوا —— جہاں گردی کا دور اور وہ جگہ جگہ پھر کر عوامی کہانیوں کا ذخیرہ جمع کرنے لگے۔ ساتھ ہی موسیقی کا شوق بھی پیدا ہوگیا۔ اور وہ ہمہ تن اس کی تحصیل میں کھو گئے۔

بنجارے گویّوں کے ساتھ وہ سندھ کی ہر ہر زیارت پر پہنچے مگر جہاں بھی گئے ان کا لوک کہانیوں اور عشقیہ قصّوں کے جمع کرنے کا شوق ساتھ رہا۔ اور وہ چلتے پھرتے کابل، قندھار تک جا پہنچے اور واپسی میں ھنگلاج بھی گئے طبیعت تو آزاد تھی ہی ساتھی فقیروں کے بعض ظاہری طور طریقوں سے انحراف کیا۔ جس پر ان سے ان بن ہوگئی اور وہ ان سے الگ ہو کر اپنی ہی راہ چلنے لگے۔ کچھ مکران کا سفر کرتے ہوئے وہ لس بیلہ کے راستے سابق سندھ کے جنوب مغربی ساحل کے علاقے میں آ پہنچے۔ اور غریب مچھیروں میں رہنا سہنا شروع کردیا۔ کراچی سے ٹھٹّہ گئے جہاں ان بڑے بڑے با اثر مذہبی سربراہوں کا زور تھا جو "مخدوم" کہلاتے ہیں۔

راستہ میں ایک بڑا ہی عجیب واقعہ پیش آیا۔ چلتے چلتے انہیں پہاڑیوں میں کسی کے بڑی درد بھری لَے میں گیت گانے کی آواز سنائی دی۔ آواز ایک غار کی طرف سے آرہی تھی۔ جا کر دیکھا تو کوئی شخص ان ہی کے اشعار بڑی پُرسوز اور دردناک لَے میں گا رہا تھا۔ اس سے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا شتربان۔ جب میرا کاروان ہالا کے پاس سے گزر رہا تھا —— اور یہ جگہ جگہ شاہ لطیف کی اپنی بستی کے پاس ہی تھی —— تو اُس نے یہ گیت سنا تھا، پہلے ہی بیت نے اس پر ایسا گہرا اثر کیا کہ وہ اپنے اونٹوں اور کارواں، سب چھوڑ کر صحراؤں میں اسی گیت کو گاتا پھرتا ہے۔ یہ بیت شاہ صاحب کی

"سُرستی" ہی کا وجد انگیز بیت تھا۔ جس میں سسّی کے ہونٹوں پر یہ بول تھے:۔

"میں اپنے ہوت، پنّوں، کو ڈھونڈنے اکیلی ہی جاؤں گی۔"

لطیف خود صاحبِ درد تھے اس لئے اس شخص کا درد اور اندرونی کرب خوب جانتے تھے۔ انہوں نے اس سے پوچھا کیا تم اس سے اگلا بیت بھی سننا چاہتے ہو؟

شتربان نے بڑا اشتیاق ظاہر کیا۔ تو لطیف بولے سنو:۔

"راستہ میں بڑے ہی دشوار گزار پہاڑ ہیں
اور نیزوں کی طرح تیکھی چٹانیں۔"

یہ سن کر وہ شخص تقریباً بیہوش ہو گیا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے التماس کی کہ یہ سارا بند پورا کر دو۔ لطیف نے ایسا ہی کیا:۔

"مگر میری تکلیفیں، میری تمنّا، ہمیشہ میرے محبوب کی
طول طویل تلاش میں میری وفادار ساتھی رہے گی۔"

یہ اشعار اس شخص کی طاقت برداشت سے کہیں زیادہ تھے۔ وہ غش کھا کر گر پڑا۔ یہ دیکھ کر لطیف بہت پریشان ہوئے۔ جھک کر اسے چھوا، مگر وہ غریب واصل بحق ہو چکا تھا!

لطیف نے اس کو وہیں سپردِ خاک کر دیا۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

پھر کیا ہوا سنئے:۔ واقعات نے کیسے کروٹ لی۔ گھر چھوڑ کر تین سال گھومنے پھرنے کے بعد ٹھٹھہ پہنچے جہاں ان کی مخدوم معین سے ملاقات ہوئی۔ ہوتے ہوتے وہ ایک دوسرے کے بڑے ہی گہرے دوست بن گئے۔ معین جانتا تھا کہ بیٹے کی اچانک جدائی سے باپ کا کیا حال ہوا تھا اور کس طرح تڑپ تڑپ کر

دن رات یہ دعا کرتا تھا کہ اس کا فرزند دلبند واپس لوٹ آئے۔ انہوں نے کہا اب یہی بہتر ہے کہ یہ یوسف گم گشتہ پھر اپنے گھر اپنے یعقوب کے پاس پہنچ جائے۔ اب ان کا مزاج، اور ان کی دنیا ہی اور ہو چکی تھی، نہ وہ جوش نہ خروش، نہ لاابالیانہ پن۔ سو جس طرح ایک دن اچانک غائب ہوئے تھے۔ اسی طرح گھر جا بھی پہنچے۔

اور پھر واقعات نے اس سے زیادہ عجیب پلٹا کھایا۔ لطیف کی کہانی واقعی ایک پریم کہانی بن گئی۔ ابھی انہیں واپس ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مسلح ڈاکوؤں نے دولت کے نشے سے سرشار مرزاؤں کے قلعے پر ہلہ بول دیا۔ اور ان کا سارا مال و دولت لوٹ کر لے گئے۔

یہ لوگ کسی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ واپس آ کر بدلہ لینے کی ٹھانی، اور عین ان لٹیروں کے ٹھکانوں پر حملہ کرنے کے لئے چل پڑے۔ شاہ لطیف اب وہ پہلے شاہ لطیف نہ تھے۔ ان زبردستوں کے ہاتھوں زیردست سادات پر جو گزری تھی اور جو بدسلوکی انہوں نے روا رکھی تھی وہ اُس کو بھلا چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس آڑے وقت میں اپنی اور اپنے خاندان کی مدد پیش کی۔ مگر مغل بیگ کی وہی آن باقی تھی۔ بھلا وہ ان کی مدد کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ اس نے اس کو بڑی نفرت سے ٹھکرا دیا۔ غرض مرزا تن تنہا لڑائی کے لئے روانہ ہوئے اور بہت بری شکست کھائی۔ ان کے اکثر آدمی مارے گئے۔ عورتوں نے اس کو سادات کی بددعا کا نتیجہ سمجھا، جن کے ساتھ مرزاؤں نے ایسا بُرا سلوک کیا تھا۔ چنانچہ اس کی تلافی کے لئے انہوں نے لطیف کو مغل بیگ کی اس صاحبزادی سیدہ بیگم کو رشتہ میں پیش کیا اور اس کے نام کی مناسبت یوں عجیب اور پُراسرار طور پر پوری ہوئی۔ اس طرح محبت آخرکار کامیاب ثابت ہوئی۔ محبت جو کسی مشکل کو مشکل نہیں جانتی اور شکست سے ناآشنا ہے۔ جو آخرکار اپنے جذبہ و جوش اور جدوجہد کی بدولت منزلِ مقصود سے ہمکنار ہو کر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ لطیف کا محبوب مجازی ہو یا حقیقی، ان کا نغمہ تمام تر عشق و محبت کا ہی نغمہ ہے اور وہ خود تمام تر عشق و محبت ہی کے شاعر ہیں ؛

وادیٔ بولان:

لیلی مور

لیلی مور

عاصمہ حسین

کون ہے جو سردیوں کا موسم آنے پر بلوچستان کے سراوان اور بھلاوان نامی علاقوں سے گزرا ہو اور اس نے یہاں کے قافلہ در قافلہ پہاڑی قبیلوں کو سندھ روانہ ہوتے ہوئے "لیلی مور" کا صدہا سال پرانا گیت گاتے نہ سنا ہو۔ وہ لیلی جو مور کی طرح خوبصورت ہے۔ جب یہ لوگ سندھ کے گرم علاقوں کو روانہ ہونے سے پہلے جشن مناتے، سجی یعنی بھونی ہوئی سالم بھیڑ کھاتے، لوک گیت گاتے اور ملکۂ حسن کے گرد انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ چاندنی رات کی پُرکیف فضا میں کوہستانی ناچ ناچتے ہیں تو ایک ایسا سماں بندھ جاتا ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل کی نظم میں اسی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے:

جگمگ جگمگ کرتا چاند
اُجلی اُجلی پھیلی دھرتی

جوت ہی جوت کا فرش بچھا
سرمئی نیلا نیلا امبر

جیسے ناچتے مور کے پنکھ
جھلمل جھلمل کرتا میداں
جادو ہی جادو کا سماں!

•

جانے کیوں ہر چار طرف سے
نگر نگر سے ڈگر ڈگر سے
لوگ ہی لوگ چلے آتے ہیں
جیسے دیپ کنول کے دوارے
ٹوٹ کے آتے ہیں پروانے
ڈیروں پہ ڈیرے گاؤں پہ گاؤں
چل چل کرتاروں کی چھاؤں
پاس نہ دور کی پروا کوئی
وہ کیا جانیں کیا ہے دوری
دل میں سمایا رات اور دن جب
لیلیٰ مور ہی کا سودا ہو
لیلیٰ مور کو دیکھنے جائیں
ہر ہر دل میں یہی سمائی
لیلیٰ مور کا مکھڑا دیکھیں
ایک جھلک اُس حسن کی پائیں
جس سے نشے تن من پر چھائیں
لیلیٰ مور جو مایۂ جاں ہے
لیلیٰ مور جو جانِ جہاں ہے

ہر انسان کی روح رواں ہے
آن کی آن میں لاکھوں ہزاروں
تن گئے خیمے، کھنچیں طنابیں

•

جاگ اٹھا جنگل کا جنگل
جنگل میں منگل ہی منگل
لَو دے اٹھیں گھر گھر آگیں
لیلیٰ مور کے جشن کی دھومیں
دل ہی دل میں یہ سب چاہیں
شب بھر دید کی عید منائیں
پھر کہیں دور ٹھکانہ ہو گا
تج کے وطن کو جانا ہو گا
کہاں میسر بات پھر ایسی
حسن پھر ایسا رات پھر ایسی
جس کی دید سدا کا جینا
سدا کی مے اور سدا کی مینا
اس محفل میں جو بھی آئے
رقص کا دیوانہ بن جائے

•

لو اُٹھے کہسار کے جائے
درسِ ادب آنکھوں کو سکھائے
دیکھو کیسے الغوزوں سے

نَے کے سُر والے باجوں سے
میٹھے رسیلے بول اٹھے ہیں
دشت اور در سب جھوم رہے ہیں
ڈھولوں کی سنگت کا جادو
جن سے بلاوا پہنچا ہر سو
"آؤ، آؤ، آؤ، آؤ
ناچ ما ہر کے روپ دکھاؤ"
ایسے رقص کی دھوم مچے گی
یہ شب کبھی نہ بھول سکے گی
وہ سنجی وہ بھونی بھیڑیں
اور سردی کی لمبی راتیں!
ان میں یہ جشنِ شاہانہ
چنگ وچغانہ، مئے مغانہ
قہقہے، چہچے، باتیں چیتیں
مہمانی کی رسمیں ریتیں
ہنسیاں خوشیاں دل گرمائیں
دلولے اور مچلتے جائیں

•

لے کے اپنا مال اور ساماں
اپنا اناج اور ڈھور اور ڈانگر
اپنے برتن، بوریا بستر
اونٹ خوشی کے ساتھ خراماں

شوق بھرے یہ قافلے اُن کے
دور قریب سے آنے والے
لَیلی مور جو ایک نظر سے
دیکھ لے ان کو، یہ متوالے
جیون جیون شاد رہیں گے
اور وہ رقص، وہ رقصِ یگانہ
اس کی خاطر نذرِ رشبانہ
اس کی خاطر ان کی جنگیں
اس کے لئے جیون کی ترنگیں
دلوں کی رانی، حسن کی رانی
روپ کی وہ مورت لافانی
لَیلی مور وہ اس کے دوارے
حلقہ باندھے تن من وارے
گھوم گھوم کے جھک جاتے ہیں
فرطِ ادب سے رک جاتے ہیں
وہ جو کہے تو کون نہ آئے؟
کون نہ اپنی جان لُٹائے؟
ناچ میں اُن کے دل کی دھڑکن
ناچ میں کھویا ان کا تن من
ناچ میں ان کی روح رچی ہے
اُن کی آن اور شان اسی میں
کوئی نہ کھوٹ نہ میل دلوں میں

عورتیں تک بھی اس کو چاہیں
دل میں رشک کی آنچ نہیں ہے
نیلی مور پہ بل بل جائیں
میٹھی رسیلی نیلی مور
کامنیوں کی کامنی نار
جس کے حسن اور زیبائی سے
وہ خود اپنی جوت جگائیں
چاند اور چاندنی رات کا جوبن
جس سے کنول دل کے کھل جائیں
اس میں یہ اور بھی پیارا سماں
ایسا رقص اور نیلی مور
جادو بھرے وہ اس کے نیناں
مدھبری پاکیزہ مُسکانیں
چاندنی رات کو جو بخشیں

•

رات کٹی اور سمے بھی بیتا
محو ہوا یہ سماں سہانا
چاند، نہ جشن، نہ گانے بجانے
رقص نہ رقص کے وہ متوالے
اور نہ کوئی نیلی مور!
شمع نہ شمع کے وہ پروانے
پو پھٹی، قافلے دور سدھارے

سندھ کے پھیلے میدانوں میں
گرم آغوش ہے جن کی فضا
نیلی مور کا پیارا پنچھی
راج دلارا، کلغی والا
اس کے سنگ رہے متوارا
اس کے ہاتھ سے کھائے چوگا

•

ختم ہوا جب یہ ہنگامہ
بیت چکی جب سگری رین
تب آیا کہیں بھور بھئے وہ
ایک جواں قسمت کا مارا
نیلی مور کا سچا پریمی
وہ البیلا وہ متوالا
اب آئے سے کیا ہووت ؟
کیسے وہ قسمت کو رویا !
لب پر سسکیاں، آہیں، نالے،
یہ ہیں نشاں اس کے پاؤں کے
یہاں تھے خیمے، یہاں قناتیں
یہاں تھے جشن کے ہنگامے
یہ ہیں نشاں گزری ہوئی شب کے
یہاں حسین نیلی کا محمل
یہاں تھی پیار بھری محفل

نیلی مور! او نیلی مور!!

•

آگیں ساری سرد ہوئیں
اور بجھ گئے سارے انگارے
کچھ بھی نہیں، اب کچھ بھی نہیں یاں
کیا ہے یہاں، ہو حق کا سماں!
جیسے جیسے دیکھے، ڈھونڈھے
ملیں نشانیاں بکھری بکھری
یہ ہے دوپٹہ، یہ ہیں بُندے
یہ ہے رنگ برنگا فیتہ
اور یہ پھول جو کبھی گُندھا تھا
اس کے مہکتے جُوڑے میں

•

آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ نکلے
لے لے نام وہ لب پر آئیں
اونچی سانسیں، اونچی کراہیں!
پر اب رونے سے کیا حاصل؟
نالے پہاڑوں کے سینوں سے
ٹکرا کر یوں نہیں لوٹ آئیں
درد بھری فریادیں ان ہیں
گونج گونج کے رہ جائیں!

•

شاید ہے جو اس کو آنکھیں
پھر کبھی جیتے جی دیکھیں
لیکن پھر بھی نیلی مور
ہیں ترے پاس وہ میٹھے دارو
دور ہوں جس سے دکھ پریمی کے
تو جو حسن ازل کا نشاں ہے
حسن ازل سب ہستی جس سے
ہر اک کیف اور مستی جس سے
جس کا ہر ہر دل میں ارماں
جو ہے ہر اک درد کا درماں

آبِ رواں کی سرزمین:

مہوا

گونائی بی بی

دیوانی مدینہ

کاجل ریکھا

آئینہ بی بی

مہوا

یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ انسانوں کی چوری بہت عام تھی۔ اس زمانے میں گارو پہاڑ کے اتر اور رہمانی پہاڑ کے دامن میں خانہ بدوشوں کا ایک قبیلہ آباد تھا۔ جان متی کا کھیل دکھا کر اور موقع ملنے پر ڈاکے ڈال کر یہ قبیلہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ایک نہایت کریہہ صورت اور دیو ہیکل انسان ہومڑا اس قبیلے کا سردار تھا۔

ایک رات ہومڑا نے اپنے آدمیوں کے ساتھ قریب کے ایک گاؤں پر ڈاکہ ڈالا۔ ایک گھر میں ہومڑا کی نظر ایک چھ مہینے کی بچی پر پڑی۔ بچی کا معصوم حسن اُسے اس قدر بھلا معلوم ہوا کہ اُسے بھی اُٹھا لایا۔ بڑے جتن اور چاؤ سے ہومڑا نے بچی کو پالا۔ اپنے سارے کرتب اور کمال اسے سکھائے۔ اور بڑی سوچ بچار کے بعد اس کا نام مہوا رکھا۔

قزاقوں اور اٹھائی گیروں کی اس دنیا میں پرورش پاکر مہوا سولہ سال کی ہوئی۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کا حسن نکھرتا گیا۔ ہومڑا اُسے ساتھ لے کر گاؤں گاؤں پھرتا اور اپنے کرتب دکھاتا۔ گاؤں کے لوگ ہومڑا کے تماشوں سے زیادہ مہوا کے حسن سے مسحور ہو جاتے۔ اور دل کھول کر انعام اکرام دیتے۔ اس طرح مہوا کے طفیل ہومڑا کی آمدنی پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی۔

اس طرح گھومتے پھرتے یہ قافلہ ندیا ضلع پہنچا اور کونگ شائی ندی کے کنارے انہوں نے ڈیرہ ڈالا۔ وہاں قریب کے گاؤں میں ایک نوجوان نو دیر چاند (ندیا کا چاند) رہا کرتا تھا،

وہ بھی بے حد خوش شکل تھا اور دولت مند بھی۔ ہومڑا کے کرتب دیکھنے کے لئے نودیر چاند بھی گاؤں کے باہر کھلے میدان میں پہنچا اور پہلی ہی نظر میں مہوا کے حسن کی کشش اس نے محسوس کی۔ ہومڑا کو اس نے مالا مال کر دیا۔ ڈیرہ ڈالنے کے لئے اُسے زمین خرید کر دی۔ پھر بھی مطمئن نہ ہوا۔ مہوا کی خاطر اس قافلے کو وہ کچھ اور دینے کے لئے بیتاب تھا جتنی دولت دیتا اور دینے کی خواہش بڑھتی جاتی۔

ایک دن جب کہ مہوا غسل کرنے ندی کی طرف جا رہی تھی۔ نودیر چاند کو اس سے تنہائی میں بات کرنے اور حالِ دل کہہ سنانے کا موقع ملا۔ پھر رفتہ رفتہ ان کی یہ چوری چھپے کی ملاقاتیں بڑھتی رہیں۔ پہروں وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے۔ اب نودیر چاند کو مہوا کے سوا دنیا کی ہر چیز سے وحشت ہونے لگی تھی۔ مہوا کو بھی اس کی یہ چاہت پسند تھی۔ مگر ہومڑا کے ہوتے ہوئے ان کی امیدوں کا پورا ہونا محال نظر آتا تھا۔ ہومڑا کو مہوا کی وجہ سے بڑی آمدنی تھی اور پھر اس کے باپ کی طرح ہونے کے باوجود اس کا دل بھی عشق کی کسک سے بے نیاز نہ تھا۔

مہوا اور نودیر چاند جتنا سوچتے اتنا ہی اپنے مستقبل کو تاریک پاتے۔ بالآخر سوچ کر انہوں نے وہاں سے بھاگ نکلنے کا فیصلہ کیا اور ایک رات چپ چاپ وہاں سے بہت دور نکل گئے اور اترے ندی کے کنارے پہنچ کر دم لیا۔ یہاں کا سناٹا اور خوبصورتی انہیں اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے وہیں ایک جھونپڑا ڈال لیا۔ اُن کی زندگی ہر قسم کے فکروں سے آزاد تھی۔ رنج غم کا اس چھوٹے سے جھونپڑے میں کہیں گذر نہ تھا۔ ایک پھول اور ایک بھونرا۔ اپنی گہری محبت کے سہارے دونوں نے زندگی بنانی شروع کی۔

ہومڑا جب سو کر اٹھا تو مہوا لاپتہ تھی۔ بہت ڈھونڈا مگر کہیں اس کا پتہ نہ چلا۔ اور معلوم ہو سکا تو صرف اتنا کہ نودیر چاند بھی غائب ہے۔ غم اور غصہ نے اس کی حالت غیر کر دی۔ اُس نے دونوں سے انتقام لینے اور اس سازش کا مزا چکھانے کی ٹھان لی۔ اور اسی وقت ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ایک زمانے تک وہ گاؤں گاؤں شہر شہر کی خاک چھانتا پھرا۔ اور اتفاقاً ایک دن اترے ندی پر پہنچ کر اُس نے بھی اپنا ڈیرہ ڈال دیا۔

ھوا کو اس کی آمد کی بھنک پڑ گئی۔ اُس نے اپنے شوہر سے گڑگڑا کر وہاں سے بھاگ چلنے کی التجا کی۔ مگر نودیر چاند کو اپنی طاقت پر پورا بھروسہ تھا۔ اس نے ھوا کو سمجھایا کہ اس کے جیتے جی کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مگر ھوا کی تسلی نہ ہو سکی۔ اُس نے نودیر چاند کو سمجھایا کہ ہومڑا کتنا سفاک، بے رحم اور خطرناک انسان ہے۔ غم اور غصے نے اسے کس قدر وحشی بنا دیا ہوا۔ ھوا کے سمجھانے سے نودیر چاند تیار ہو گیا کہ اس رات وہ دونوں وہاں سے بھی بھاگ چلیں۔

لیکن قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ ہومڑا کہیں سے چھُپ کر ان کے سارے منصوبے سُن رہا تھا۔ اور عین اس وقت جب کہ دونوں روانہ ہو رہے تھے۔ وہ آن دھمکا نودیر چاند کا گلا پکڑ کر اور خنجر باہر نکال کر وہ چنگھاڑا۔ کہ اب اس کے ہاتھوں سے بچ نکلنا مشکل ہے۔

ھوا نے نہایت سکون سے یہ منظر دیکھا۔ وہ آگے بڑھی۔ اور ہومڑا کو مخاطب کر کے کہنے لگی

"ابا۔ یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ اس بدکردار انسان نے بہکا کر مجھے آپ سے الگ کر دیا تھا۔ آج میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں کہ بالآخر آپ میری نجات کا پیام بن کر آ پہنچے۔ مگر آپ اپنے ہاتھ اس کے خون سے کیوں آلودہ کرتے ہیں۔ اس نے دکھ تو زیادہ مجھے پہنچایا ہے۔ اس لئے انتقام لینے کا حق بھی مجھے پہنچتا ہے۔ لائیے اپنا خنجر مجھے دیدیجئے کہ اس نامراد کو کئے کی سزا دے سکوں۔"

خوشی اور حیرت سے ہومڑا بوکھلا گیا۔ یہ دیکھ کر کہ اُس کی پروردہ بھی اسی کی طرح وحشی ہے اُسے بڑی مسرت ہو رہی تھی۔ اس سے کچھ بن نہ آئی۔ بیٹی کی جرأت کو سراہتے ہوئے اس نے خنجر اُس کے حوالے کیا۔

ھوا خنجر لے کر نودیر چاند پہ لپکی، اور للکار کر بولی۔

"او نامراد شاید تجھے نہیں معلوم کہ میں ایک خانہ بدوش لڑکی ہوں میرا دل پتھر سے زیادہ سخت ہے۔ موت میرا کھلونا ہے۔ دیکھ آج کس طرح تجھے سزا دیتی ہوں۔"

ہومڑا دحشت و بربریت کے اس منظر سے بڑا مسرور تھا۔ اس کے غضبناک قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔ اس کے لئے یہ منظر کس قدر دل فریب تھا۔ مگر دوسرے لمحے وہ ششدر

رہ گیا۔ جب اس نے دیکھا۔ کہ خنجر نودیر چاند کی بجائے مہوا کے سینے میں پیوست تھا اور وہ فرش پر پڑی دم توڑ رہی تھی۔

نودیر چاند جواب تک مبہوت کھڑا تھا۔ مہوا کو خاک و خون میں لوٹتا دیکھ کر دفعتاً جیسے ہوش میں آ گیا۔ ایک دل دوز چیخ کے ساتھ وہ اُس کی لاش پر گرا۔ اور مہوا کو جا لینے کے لئے خود بھی دوسری دُنیا میں پہنچ گیا!

گونائی بی بی

یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ باریسال ضلع کا قصبہ سالگرام دولت، فراغت اور خوش حالی کا مسکن تھا۔ یہیں ایک دولت مند آدمی قاضی رفیق نامی رہتا تھا۔ قاضی رفیق دھن دولت کے ساتھ ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی بہرہ ور تھا۔ اس کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکی سب سے چھوٹی تھی۔ اس کا نام گونائی بی بی تھا۔ اللہ نے گونائی بی بی کو ایسا حسن عطا کیا تھا کہ جو بھی اسے دیکھتا۔ بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ بچّی ذرا بڑی ہوئی تو اسے گاؤں کے ایک مکتب میں بھیج دیا گیا۔ مکتب میں بہت سے لڑکے تھے جن میں صورت شکل کے اعتبار سے طوطا میاں سب میں ممتاز تھا۔ یہ بھی گاؤں کے ایک خوش حال اور دولت مند گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ پہلے ہی دن گونائی بی بی کے معصوم دل میں اس کی طرف سے ایک اُنس سا پیدا ہو گیا۔ جس نے بڑھتے بڑھتے محبت کی شکل اختیار کر لی۔ محبت دو طرفہ تھی۔ طوطا میاں کا بھی وہی حال تھا۔ دن گذرتے گئے۔ قاضی رفیق کا انتقال ہو گیا۔ اب دونوں بھائی گونائی بی بی کے سرپرست بن گئے۔ گونائی بی بی بڑی ہو گئی۔ عمر کے ساتھ حُسن بڑھا اور اس سے بھی زیادہ طوطا میاں کی محبّت۔

سالگرام کے ایک بوڑھے دولت مند، دِلو میاں کی نظر گونائی بی بی پر پڑی اور وہ اسے اپنانے اور حاصل کرنے کی دُھن میں جی جان سے لگ گیا۔ طوطا میاں اور دِلو میاں کے پیام قریب قریب ایک

ساتھ بھائیوں کے پاس پہنچے۔ چھوٹا بھائی چاہتا تھا کہ اس کی بہن کا بیاہ طوطا میاں سے ہو جائے۔ مگر بڑا بھائی دولت اور مرتبے کو دیکھ کر دلو میاں کا طرفدار بن گیا۔ غرض بڑے جھگڑے اور مخالفتوں کے بعد طوطا میاں کے حق میں فیصلہ ہوا اور دونوں کا بیاہ ہو گیا۔ اس ناکامی نے دلو میاں کو آگ بگولا کر دیا۔ گوناں بی بی کو طوطا میاں سے چھڑا کر اپنانے کی فکر میں مبتلا ہو گیا۔ انتقام کی اس خواہش کے ساتھ اس کی محبت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر وقت گوناں کا تصور اس کے دل و دماغ پر چھایا رہتا۔ روزانہ اُسے نظر بھر کر دیکھے بغیر چین نہ آتا۔ گوناں بی بی تالاب پر نہانے جاتی۔ دلو میاں اسے دیکھنے کی خاطر کبھی تالاب کے اُس پار چلا جاتا اور کبھی راستے میں "لوکل" کے پھولوں کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ رہتا۔ شدہ شدہ یہ بات طوطا میاں کو معلوم ہو گئی۔ اور اس نے گاؤں کے ایک بے وقوف لڑکے مانک کو "لوکل" کا درخت کاٹ ڈالنے پر راضی کر لیا۔

مانک جب درخت کاٹ رہا تھا تو دلو میاں وہاں پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ مانک جس ڈال پر بیٹھا ہے۔ اسی کو کاٹ رہا ہے۔ اس نے پکار کر مانک کو خبردار کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مانک اور ڈال دونوں نیچے آ رہے۔ اور مانک بری طرح زخمی ہوا۔ اتفاقاً اسی وقت گوناں بی بی نہا کر تالاب سے لوٹ رہی تھی۔ اُس نے مانک کو اٹھایا اور اس کے گھر لے گئی۔ مگر مانک راستے ہی میں ختم ہو چکا تھا۔

دلو میاں کو نئی سوجھی۔ جھٹ پٹ تھانے میں رپورٹ کر دی کہ طوطا میاں نے مانک کو قتل کر دیا ہے۔ پولیس پہنچی اور طوطا میاں کو گرفتار کر لیا۔ شوہر کی گرفتاری نے گوناں بی بی کو بدحواس کر دیا۔ اُسے نہ کھانے پینے کا ہوش تھا اور نہ کسی بات کا۔ ہر وقت یہی فکر رہتی کہ کس طرح شوہر کو رہائی دلائے۔ ایک دن اس نے اپنے شوہر کے چھوٹے بھائی بشیر سے التجا کی کہ "مجھے شہر لے چلو" بشیر بھی ایک زمانے سے گوناں کی محبت میں مبتلا تھا۔ فوراً اُس نے کشتی کا انتظام کیا اور دونوں شہر کے لئے چل نکلے۔ راستے میں بشیر نے اپنے دل کا راز جسے وہ زمانے سے چھپائے ہوئے تھا، گوناں بی بی کو سنا دیا۔ گوناں بی بی نے اُس سے کہا "میں شادی شدہ ہوں۔ عورت زندگی میں صرف ایک کی ہو سکتی ہے۔ میں کوئی پھل ترکاری نہیں کہ سب میں بانٹی جا سکوں"۔

اس جواب نے بشیر کو گویا ایک خواب سے جگا دیا۔ اسے اپنے خیالات پر بڑی ندامت ہوئی اور اُس نے گوناگی بی بی سے وعدہ کیا کہ ہر قیمت پر وہ طوطامیاں کو چھڑانے کی کوشش کریگا۔

گوناگی بی بی اور بشیر شہر پہنچے اور ایک تالاب کے کنارے سستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ تالاب پر دو لڑکیاں نہا رہی تھیں۔ ایک بڑھتے بڑھتے گہرائی کی طرف آ گئی اور غوطے کھانے لگی۔ بشیر نے یہ دیکھکر فوراً تالاب میں چھلانگ لگائی اور اسے باہر نکال لایا۔ لڑکی بڑی ممنون ہوئی اور بہ اصرار دونوں کو اپنے گھر لے گئی۔ گوناگی بی بی کو لے کر وہ سیدھی زنان خانے میں پہنچی اور ماں کو سارا قصّہ سنایا۔ گوناگی بی بی کو دیکھ کر اُس نے تاڑ لیا کہ یہ کسی شریف گھرانے کی عورت ہے، بڑی شفقت اور نرمی سے پیش آئی۔ گوناگی بی بی نے اپنی غمناک داستان سنائی۔ خوش قسمتی اور حسنِ اتفاق سے یہ گھر اُس جج کا تھا جس کے سامنے طوطامیاں کا مقدمہ پیش تھا۔ جج کی بیوی نے گوناگی بی بی کو بڑی تسلی دی۔ طوطامیاں کو رہائی دلانے کا وعدہ کیا اور مقدمہ ختم ہونے تک اسے اپنے ہی گھر میں رہنے پر رضامند کر لیا۔

جج صاحب اپنے اُصول کے بڑے پکے تھے۔ بیوی سے سارا قصّہ سُن کر بھی انہوں نے یہی کہا کہ مقدمہ بہرحال چلے۔ بیوی کی بڑی منت سماجت کے بعد انہوں نے صرف اتنا کیا کہ خفیہ پولیس کو سالگرام پہنچ کر اس معاملے کی تحقیقات کرنے کا حکم دیا۔

خفیہ پولیس کی تفتیش سے پتہ چلا کہ یہ سب کچھ دلّو میاں کی سازش تھی ورنہ طوطامیاں بالکل بے قصور تھے۔ مقدمہ ختم ہو گیا اور طوطامیاں رہا کر دیئے گئے۔ مگر اُدھر سالگرام میں کسی نے خبر اُڑا دی کہ طوطامیاں کو پھانسی ہو گئی۔ اس اطلاع سے دلّو میاں کے ہاں تو سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ ان کے خیال میں اب میدان صاف تھا۔ گوناگی بی بی سے بیاہ کرنے اور چین کی زندگی گزارنے کے سہانے خواب انہیں حقیقت بنتے نظر آ رہے تھے۔

ایک رات گوناگی بی بی اور طوطامیاں سالگرام پہنچے مگر گوناگی بی بی نے ایک نئی چال سوچی۔ اس نے طوطامیاں کو چھپا دیا۔ اور خود اکیلی ایک جگہ گھاس پر جا بیٹھی۔ دلّو میاں کو خبر ملی تو اپنے ایک دوست رحمٰن کے ساتھ خوش خوش آن پہنچے۔ اور بڑی نیازمندی کیساتھ

گونائی بی بی سے بیاہ کی درخواست کی۔ وہ خاموش رہی۔ اس پر رحمٰن نے مشورہ دیا کہ تم اپنی ساری جائداد اسی وقت گونائی بی بی کے نام لکھ دو، شاید وہ اس طرح راضی ہو جائے۔ دلّو میاں فوراً مان گئے اور اپنی ساری جائداد جس کی مالیت کوئی نو لاکھ روپے تھی، وہیں گونائی بی بی کے نام لکھ کر راضی نامہ اس کے حوالے کیا۔ عین اسی وقت ادھر سے طوطا میاں نمودار ہوئے۔ ان کو دیکھ کر حیرت اور پریشانی سے دلّو میاں کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ طوطا میاں نے گونائی بی بی کے ہاتھ سے وہ پرچہ لیکر دلّو میاں کو دینا چاہا۔ مگر گونائی بی بی نے جھپٹ کر اُن سے چھین لیا۔ پرچے کے اُس نے وہیں پُرزے پُرزے کر ڈالے اور انھیں دلّو میاں کے منہ پر پھینکتے ہوئے کہا: "تم اپنی دولت کے زور سے ساری دنیا خرید سکتے ہو مگر یاد رکھو ایک عورت کا دل کسی دام بھی تمھیں نہیں مل سکتا۔"

دیوانی مدینہ

پوربی بنگال کے بنیا چوگ کا دیوان شونا پھر بہت دولت مند زمیندار تھا۔ اُس کے دو لڑکے تھے آلاک اور دولاک۔

ایک مرتبہ اس کی بیوی سخت بیمار ہوئی۔ ہزاروں علاج معالجے ہوئے۔ مگر حالت بگڑتی ہی گئی۔ جب مہرا کو یقین ہوگیا کہ اب وہ کوئی دم کی مہمان ہے تو اس نے شونا پھر کو بلایا اور اُس سے کہا کہ میں اپنی دو نشانیاں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ ان کی دیکھ بھال اور اچھی پرورش ہی سے تم میری رُوح کو چین پہنچا سکتے ہو۔ مہرک نے اپنے شوہر سے بڑی التجا کی کہ وہ دوسری شادی نہ کرے۔

اس وقت اسے ایک کبوتر اور کبوتری کا قصہ یاد آیا جو بڑی محبت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ کبوتری نے دو انڈے دیئے۔ پھر یکایک بیمار ہو گئی۔ اور جب مرنے کو ہوئی تو کبوتر کو سخت تاکید کی کہ وہ اپنے گھونسلے میں دوسری کبوتری نہ لائے۔ انڈوں کی خود دیکھ بھال کرے اور بچوں کی پرورش بھی خود کرے۔ کبوتری مر گئی۔ کبوتر خود ہی انڈے سیتا رہا۔ جب بچّے نکل آئے، تو بڑے چاؤ سے اُنہیں پالا۔ مگر اب ایک نئی فکر دامن گیر ہو گئی۔ چگنے کے لئے باہر جاتا تو بچے اکیلے رہ جاتے۔ بغیر چگے نہ اپنی زندگی ممکن تھی اور نہ بچّوں کی۔ اور بچّوں کو اکیلا چھوڑنا بھی ناممکن۔ بڑی سوچ بچار کے بعد وہ دوسری کبوتری لے آیا۔ اسے بچّوں کی دیکھ بھال کی بڑی تاکید کی اور خود چگنے کے لئے چلا گیا۔ کبوتری نے سوچا کہ کبوتر کی محبت کے مرکز یہی بچے ہیں۔ اگر اس کے بچے ہوں تو ان کا کیا ہوگا۔ یہی سوچ کر اُس نے دونوں کو مار ڈالا۔ جب کبوتر واپس ہوا تو بڑے

دردناک انداز سے رونے لگی کہ ایک باز گھونسلے میں آکر بچّوں کو مار گیا ۔ بے چارہ کبوتر صبر کر کے چُپ ہو رہا ۔

یہ قصّہ سُنا کر مہرا نے شوہر کو دوسری شادی نہ کرنے کی سخت تاکید کی اور کچھ عرصہ بعد مر گئی ۔ مہرا کے بعد شونا پھوجی جان سے آلال اور دولال کی دیکھ بھال میں لگ گیا ۔ لیکن اس مصروفیت کی وجہ سے زمینداری کے کاموں میں خلل پڑنے لگا ۔ شونا پھر کے کارندے اور مشیر اس سے بڑے گھبرائے ۔ انھوں نے اسے سمجھایا کہ دوسری شادی کرے ۔ شونا پھر اپنے عہد پر اڑا رہا ۔ مگر جب مشیروں نے کہا کہ اس رفتار سے اس کی زمینداری ختم ہو جائے گی اور اس کا اثر آخر کار بچوں ہی پر پڑے گا ۔ بڑی سوچ بچار کے بعد وہ دوسری شادی پر رضامند ہو گیا ۔ مگر پہلے سے اس نے یہ اہتمام کیا کہ بچے سوتیلی ماں سے ملنے نہ پائیں ۔ ان کے لئے باہر علیحدہ مکان بنایا اور خود ان کی دیکھ بھال کرتا ۔

شونا پھر کی بیوی اس حالت سے بالکل مطمئن نہ تھی ۔ وہ سوچتی کہ اس گھر میں اس کا کچھ نہیں ۔ سب کچھ آلال اور دولال کا ہے ۔ اگر اس کے یہاں بچہ ہو تب بھی اس کا مستقبل تاریک ہی رہے گا ۔ سوچ سوچ کر ایک تجویز اس کے ذہن میں آئی ۔ ایک اسکیم بنائی ۔ ایک دن جب شونا پھر اس سے ملنے آیا تو وہ اس کے پیروں پر گر کر زار و قطار رونے لگی ۔ شونا پھر بڑا پریشان ہوا ۔ رونے کی وجہ پوچھی تو بیوی نے جواب دیا ” آپ کے گھر میں میری حیثیت ایک جانور سے بدتر ہے ۔ میں عورت ہوں ۔ سینے میں ماں کا دل رکھتی ہوں ۔ مگر کوئی نہیں سمجھتا بچّوں کو جن کی محبت میں میں دن رات تڑپتی رہتی ہوں مجھ سے اس طرح دور رکھا جاتا ہے کہ گویا میں ان کی دشمن ہوں ۔

یہ باتیں اس نے کچھ اس طرح کہیں کہ شونا پھر بھی اس کے کہنے میں آگیا اور وعدہ کیا کہ دوسرے دن وہ خود لا کر بچّوں کو اس سے ملائے گا ۔

دوسرے دن اس نے بچّوں کے استقبال کی بڑے اہتمام سے تیاریاں کیں ۔ ان کے لئے بہترین کھانے بنائے اور تحفے تیار کئے ۔ اور ایسی محبت کا اظہار کیا کہ جلد ہی سارے شہر میں

اس کے چرچے ہونے لگے کہ سوتیلی ماں بھی بچوں سے یوں محبت کر سکتی ہے۔ چند دن اسی طرح گذرے اور جب اس کو یقین ہو گیا کہ شونا پھر بھی اسی کی طرف سے مطمئن ہے تو اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ ایک جلاد کو روپے کا لالچ دے کر اس نے سازش میں شامل کر لیا۔ اس زمانے میں کشتی رانی کا ایک بڑا مقابلہ ہو رہا تھا۔ طے یہ پایا کہ بچوں کو مقابلہ دیکھنے کے لئے بھیجا جائے اور جلاد موقع پا کر دونوں کو دریا میں ڈبو دے۔ شونا پھر کو اس نے بچوں کو بھیجنے پر راضی کر لیا اور بڑے اہتمام سے تیاریاں شروع کی گئیں۔ بچوں کے لئے مور کی شکل کی ایک قیمتی کشتی تیار کی گئی۔

جلاد کشتی کا کپتان بنا اور کشتی کو دوسری طرف بہت دور لے کر چلا گیا۔ جب کشتی آبادی سے بہت دور دریا کے بیچوں بیچ پہنچ گئی تو جلاد اٹھا اور بچوں کو للکارا کہ موت کے لئے تیار ہو جاؤ۔ معصوم لڑکے بڑے پریشان ہوئے، جلاد نے انہیں سارا حال سنایا۔ بچوں نے رحم کی درخواست کی مگر جلاد کو روپے اور زمین کی لالچ اندھا کر رہی تھی۔ جب کوئی امید بچنے کی نظر نہ آئی تو آلال نے جلاد سے گڑگڑا کر کہا کہ کم سے کم دولال کو چھوڑ دے کہ خاندان کا نام لیوا باقی رہ جائے۔ مگر دولال کہتا تھا کہ وہ مر جائے گا۔ آلال کو زندہ رکھا جائے۔ دونوں بھائیوں کی اس محبت اور معصومی نے سنگ دل جلاد پر بھی اثر کیا۔ وہ سوچنے لگا اگر یہاں کے جنگل میں وہ ان دونوں کو چھوڑ دے تو کبھی یہ بنیا چوگ نہ پہنچ سکیں گے اور اس کا راز اسی طرح چھپا رہے گا۔ جلاد ابھی کوئی فیصلہ کرنے نہ پایا تھا کہ ادھر سے ایک تاجر کا بیڑہ آتا دکھائی دیا۔ جلاد نے دونوں لڑکوں کو تاجر کے حوالے کیا اور خود بنیا چوگ چلا گیا

تاجر اپنا بیڑہ لے کر دھنوان ندی کے کنارے ایک شہر کاجل کندی پہنچا۔ وہاں کے ایک بڑے زمیندار ہیرا دھر سے دھان خریدی اور معاوضے میں آلال اور دولال کو اس کے حوالے کیا۔ ہیرا دھر کے پاس دونوں سے معمولی نوکروں کے کام لئے جاتے۔ ناز و نعم میں پلے ہوئے یہ بچے محنت و مشقت کی زندگی سے جلد ہی اکتا گئے۔ چنانچہ بڑا لڑکا آلال ایک دن چھپ چھپا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

بھاگتے بھاگتے وہ بہت دور دھنک دریا کے کنارے ایک شہر میں پہنچا اور وہاں کے ایک بڑے رئیس دیوان سکندر کے پاس نوکر ہو گیا۔ آلال کے اخلاق، سلیقہ اور ایمان داری سے دیوان سکندر بڑا خوش ہوا۔ تنخواہ کا وقت آیا تو آلال نے یہ کہہ کر تنخواہ لینے سے انکار کر دیا کہ وہ سب رقم اکھٹی لے گا۔ دیوان سکندر کو دن بدن یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ ضرور کسی معزز گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ دیوان سکندر کی دو لڑکیاں تھیں، آمنہ اور مومنہ۔ جی چاہتا تھا کہ دونوں میں سے ایک کا بیاہ آلال سے کر دے مگر اس کا حسب نسب معلوم نہ تھا اور آلال بھی کچھ نہ بتاتا تھا۔ یوں ہی بارہ سال گذر گئے۔ ایک دن آلال نے دیوان سکندر سے خواہش کی کہ وہ اُسے اس کی محنت کا معاوضہ دے۔ دیوان سکندر اس کی ہر خواہش پوری کرنے کو تیار تھا۔ آلال نے کہا کہ شہر بنیا چوگ کے ایک باغ میں وہ مکان بنانا چاہتا ہے۔ مکان بنانے کا ساز و سامان، پانچ سو مزدور اور حفاظت کے لئے دو سپاہی اسے دیئے جائیں۔ دیوان سکندر خوشی سے تیار ہو گیا۔ آلال یہ سارا لاؤ لشکر لے کر چل پڑا اور بنیا چوگ کے باہر ایک باغ میں اس نے گھر بنانا شروع کیا۔

آلال اور دولال کی جدائی میں شونا بھر کی بُری حالت ہوئی۔ بیٹوں کے غم میں گھل گھل کر بالآخر وہ ختم ہو گیا۔ شونا بھر کے بعد دیوانی کا کام اُس کی بیوی اور نو عمر لڑکے نے سنبھالا۔ بیوی نے تمام پرانے ملازموں کو نکال باہر کیا۔ اور اپنے اثر کے آدمی رکھے۔ یہ سب نااہل اور بد دیانت تھے۔ دیوانی کا کام بگڑ رہا تھا اور رعایا بیزار ہوتی جا رہی تھی۔

آلال کے گھر بنانے کی خبر جب دیوان کو پہنچی تو وہ بڑا برہم ہوا۔ اپنے آدمیوں کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ وہ فوری مال گذاری ادا کرے اور دربار میں آ کر نذرانہ دے۔ آلال نے جواب دیا کہ وہ اپنے باپ کی زمین پر گھر بنا رہا ہے۔ اس لئے نہ مال گذاری کی ضرورت ہے اور نہ نذرانے کی۔ دیوان اس جواب سے بگڑ گیا اور فوج لے کر لڑنے کے لئے نکلا۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی جس میں بالآخر دیوان کو شکست ہوئی اور آلال دیوان بن گیا۔

دیوان سکندر کو یہ حالات معلوم ہوتے تو اُس نے اپنی بیٹی کا پیام بھیجا مگر آلال نے

جواب دیا کہ سب سے پہلے وہ اپنے بھائی کا کھوج لگائے گا اور پھر دونوں بھائی اس کی بیٹیوں سے شادی کریں گے۔ زمینداری کا انتظام اپنے کارندوں کو سونپ کر وہ دولال کی تلاش میں نکلا اور بھیس بدل کر کاجل کندی پہنچا۔ گاؤں کے باہر ایک بڑے درخت کے نیچے اسے چند گڈریئے نظر آئے جو گانے میں مشغول تھے۔ قریب پہنچ کر غور سے سننے پر معلوم ہوا کہ وہ اس کی اور اس کے بھائی کی زندگی کا افسانہ سنا رہے تھے۔ گڈریوں سے پوچھا یہ گانا کس نے سکھایا۔ انھوں نے سامنے ایک گھر کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں ایک شخص رہتا ہے۔ جس نے یہ گانا سکھایا ہے۔

آلال چھپ کر دولال سے ملا۔ اسے پتہ چلا کہ اس کے بھاگ نکلنے کے بعد دولال کو ہیرا دھر کی لڑکی مدینہ سے محبت ہو گئی تھی۔ دونوں نے شادی کر لی۔ ہیرا دھر نے کچھ زمین اسے دے دی ہے۔ اور اب وہ اپنی عزیز بیوی اور ایک بچے سورج جمال کے ساتھ نہایت آرام اور چین کی زندگی گزار رہا ہے۔ آلال نے اسے روداد سنائی اور ساتھ ہی اس سے خواہش کی کہ وہ اس کے ساتھ نبیا چوک چل کر دیوانی سنبھالے۔ دولال اپنی چہیتی بیوی کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر دولت کے لالچ اور بھائی کے اصرار نے اسے مدینہ کو طلاق دینے اور نبیا چوک چلے جانے پر راضی کر لیا۔ مدینہ سے اس نے یہ باتیں چھپائے رکھیں۔ طلاق نامہ لکھ کر اس کے بھائی کے حوالے کیا اور چپ چاپ بھائی کے ساتھ کاجل کندی سے نکل گیا۔

نبیا چوک پہنچ کر دونوں بھائیوں نے دیوانی سنبھالی۔ سکندر دیوان کی لڑکیوں سے بیاہ کر لیا اور نئے سرے سے زندگی بسر کرنے لگے۔

مدینہ کو جب اس کے بھائی نے یہ قصہ سنایا تو اسے یقین ہی نہ آسکا دولال کبھی اسے چھوڑ سکتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور واپس آئے گا۔ روز اس کے استقبال کی تیاری کرنا اور ہر اچھی چیز اس کے لئے اٹھا رکھنا اس کا معمول بن گیا۔ دن گزرتے گئے۔ ہر نکلنے والا سورج نئی امیدیں لاتا۔ مگر ڈوبتے وقت مایوسی کے نقش چھوڑ جاتا۔ اسی حال

میں کئی دن گذر گئے۔ مدینہ کا جوشِ انتظار یاس میں بدلنے لگا۔ ایک دن اسے خیال ہوا شاید بچے کو دیکھ کر دولال کی محبت عود کر آئے۔ اس لئے اُس نے اپنے بھائی کو مجبور کیا کہ وہ سورج جمال کو لے کر بنیا چوک جائے۔ بہن کی خاطر وہ بھی تیار ہو گیا۔ مگر جب بنیا چوک پہنچا تو دولال اُس کے ساتھ سرد مہری سے پیش آیا۔ اُس سے خواہش کی کہ فوری واپس ہو جائے۔ کیونکہ اُس کی نیک نامی پر حرف آئے گا۔

بے چارے بھائی نے کاجل کنڈی لوٹ کر مدینہ کو سارا حال کہہ سنایا۔ اس خبر سے مدینہ پر اوس سی پڑ گئی۔ بیتے دنوں کی یاد، شوہر کی بے وفائی کا احساس۔ اور بد نصیبی کے غم نے اُسے دیوانہ کر دیا۔ اس غم میں گھُل گھُل کر وہ ختم ہو گئی۔

سورج جمال اور اُس کے ماموں کو اس طرح لوٹانے کے بعد دولال کا ضمیر اُسے ملامت کرنے لگا۔ یہ ملامت اتنی بڑھی کہ بالآخر سب کو چھوڑ کر کاجل کنڈی چلے جانے پر تیار ہو گیا اور ایک دن چُپ چاپ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

جب وہ کاجل کنڈی پہنچا تو اسے ہر طرف ویرانی اور سناٹا نظر آیا۔ اُس کا گھر جو خوشیوں اور مسرتوں کا مسکن تھا۔ آج قبرستان سے زیادہ بھیانک نظر آ رہا تھا۔ وہ پنجرہ بھی تھا جس میں مدینہ کے لئے جنگل سے ایک پرندہ پکڑ کر اُس نے بند کیا تھا۔ مگر اب پنجرہ خالی تھا۔ وہ گائے بھی نظر آئی جسے اُس نے اور مدینہ نے بڑے پیار سے پالا تھا۔ مگر گائے اُسے یوں دیکھتی ہوئی چلی گئی گویا اس کی بھول پر تاسف ظاہر کر رہی ہو۔ یہ منظر دولال کو جو پہلے ہی ہوش و حواس کھو رہا تھا اور بھی دیوانہ بنانے لگے! ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ سامنے اسے ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ آتا ہوا نظر پڑا۔ قریب آنے پر اُس نے پہچان لیا۔ یہ سورج جمال تھا۔ زندہ مگر مُردے سے بدتر۔ باپ بیٹے بغلگیر ہوئے، دیر تک روتے رہے، دولال نے مدینہ کا حال پوچھا۔ جواب میں سورج جمال نے ایک قبر کی طرف اشارہ کر دیا۔ دولال روتا ہوا قبر پر گرا۔ دیر تک اس کی یہی حالت رہی۔ جب ذرا سنبھلا تو اٹھا اور عہد کیا کہ زندگی کے باقی دن اسی قبر کی مجاوری میں گذار دے گا۔ وہیں ایک جھونپڑی بنائی اور زندگی کے باقی دن اسی میں گذار دیئے۔

کاجل ریکھا

پوربی بنگال کے کسی شہر میں ایک بڑا دولت مند تاجر دھنیشور رہتا تھا۔ دو بچے بھی خدا نے اسے عنایت کئے تھے۔ لڑکی تو حسن و جمال میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ ایک لڑکا تھا جس کا نام رتنیشور اور لڑکی کا اُس نے کاجل ریکھا رکھا۔ کاجل ریکھا کا سن ابھی دس برس کا تھا مگر ابھی سے بے حد حسین نظر آتی تھی۔

دولت اور آسائش اکثر بری عادتوں کو ساتھ لاتے ہیں۔ دھنیشور کو بھی جوئے کی لت پڑی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن اپنی ساری دولت ہار بیٹھا۔ بیوی بچوں کو لیکر راستے پر ایک درخت کے نیچے پناہ لی۔ اب اُس کی آنکھیں کھلیں۔ بیٹی کی عمر گیارہ برس ہونے کو آئی۔ اس کا بیاہ ضروری تھا۔ مگر اب کون اس سے بیاہ کرے گا۔ اسی غم میں گھُل رہا تھا کہ ایک دن ایک سنیاسی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ سنیاسی کو دھنیشور کی حالت پر رحم آیا۔ ایک انگوٹھی اور ایک مینا اس کے حوالے کی اور اُسے نصیحت کی کہ مینا کی ہر بات پر عمل کرے کیونکہ یہ بڑی مقدس اور متبرک ہے۔ اگر وہ اس کے کہنے پر چلے تو بہت جلد اس کے دن پھریں گے۔

سنیاسی چلا گیا۔ دھنیشور بڑی توجہ سے مینا کی دیکھ بھال کرتا۔ ایک دن اس سے پوچھا کہ "آخر کب تک یہ گردش رہے گی۔ کب میرے دن پھریں گے"۔

مینا نے کہا کہ: "کشتیوں کے بیڑے کی مرمت کراؤ۔ سنیاسی نے جو انگوٹھی دی ہے اسے شہر میں بیچ دو۔ جو بھی پیسہ ملے وہ لیکر پورب کی طرف جھیلوں اور دریاؤں کے اُس پار چلے جاؤ۔ اس پیسے سے تجارت کرو۔ تمہاری مصیبت کا زمانہ جلد ختم ہوگا۔"

دھنیشور نے ایسا ہی کیا۔ کشتیوں کا بیڑہ لیکر نکل پڑا اور پورب کی طرف لمبا سفر کرکے ایک گاؤں میں جا ٹھیرا۔ یہاں اسے کاروبار میں بڑا نفع ہوا اور تھوڑی ہی مدّت میں پہلے سے زیادہ دولت جمع ہوگئی۔

دھنیشور کی بہت سی فکریں دُور ہو گئیں۔ پھر ایک بار عیش و عشرت کا دَور شروع ہوا۔ اب اُسے کاجل ریکھا کے بیاہ کی پھر فکر ہوئی۔ ایک دن اس نے پھر مینا سے اس کے متعلق سوال کیا۔ مینا نے کہا کہ "کاجل ریکھا کی قسمت میں بڑی گردشیں لکھی ہیں۔ اس کا بیاہ ایک مُردے سے ہونیوالا ہے۔" اور ساتھ ہی نصیحت کی کہ وہ جلد سے جلد بیٹی کو اپنے سے الگ کردے۔ مینا کی باتیں سن کر اسے بڑا دکھ ہوا۔ بڑی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ایک طرف بیٹی کی محبت اور دوسری طرف مقدس مینا کا حکم۔ ایک دن وحشت اور فکر سے اُکتا کر اس نے کاجل ریکھا کو ساتھ لیا اور جنگل کی طرف چل پڑا۔ دونوں بڑی دیر تک چلتے رہے۔ بالآخر ریکھا بالکل تھک گئی اُسے شدت سے پیاس محسوس ہوئی اور اُس نے باپ سے پانی مانگا۔ سامنے ہی ایک مندر نظر آرہا تھا۔ دھنیشور نے مندر کی سیڑھیوں پر بیٹی کو بٹھادیا اور خود پانی کی تلاش میں نکلا۔ باپ کے جانے کے بعد کاجل ریکھا اٹھی اور مندر کے بند دروازے پر ہاتھ مارا۔ ریکھا کا ہاتھ پڑنا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوئی مگر جونہی وہ اندر پہنچی، دروازہ پھر سے بند ہوگیا، اور اس کی لاکھ کوششوں کے باوجود نہ کھل سکا۔ دھنیشور پانی لے کر لوٹا تو کاجل ریکھا کا پتہ نہ تھا۔ پریشان ہو کر اُس نے آوازیں دیں۔ اندر سے ریکھا کی آواز آئی۔ دھنیشور نے دروازہ کھولنے اور پھر اُسے توڑ ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اب اسے مینا کی باتوں کا خیال آیا۔ اُس نے کاجل ریکھا سے پوچھا کہ اندر کیا ہے۔ کاجل ریکھا کو اب تک اپنے اطراف نظر دوڑانے کا ہوش ہی نہ تھا۔ باپ کی آواز سُن کر جو چاروں طرف دیکھا تو اس کا خون سرد پڑ گیا۔

اس کے سامنے ایک نوجوان راجکمار کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس حال میں کہ لاکھوں سوئیاں جسم میں چُبھی ہوئی ہیں۔ اس نے روتے ہوئے پکار کر باپ کو یہ ماجرا سنایا اور اُس سے کہا کہ یہ اس کی قسمت کا لکھا ہے۔ یہی لاش اس کا شوہر ہے۔ اب اس کی سیوا اُس کا فرض ہے دھنیشور اپنی قسمت کو روتا ہوا گھر لوٹا۔

کاجل ریکھا کا بھی روتے روتے بُرا حال تھا۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ یکایک پھر سے دروازہ کھلا اور ایک سنیاسی نمودار ہوا۔ کاجل ریکھا اس کے قدموں پر گر گئی۔ سنیاسی نے اسے تسلّی دی اور کہا کہ وہ راجکمار کے جسم سے ساری سوئیاں نکالے مگر آنکھوں میں چبھی ہوئی دو سوئیاں چھوڑ دے۔ پھر ایک پتّہ دے کر اس سے کہا کہ ساری سوئیاں نکل جانے کے بعد اس کا رس راجکمار کے جسم پر ملے اور آنکھوں کی سوئیاں بھی نکال دے۔ راجکمار زندہ ہو جائیگا۔ مگر سنیاسی نے سخت تاکید کر دی کہ ریکھا کسی حالت میں بھی راجکمار کو اپنا نام و نشان اُس وقت تک نہ بتلائے جب تک کہ وہ مقدس مینا خود آ کر اس کا تعارف نہ کرا دے۔

ریکھا سنیاسی کے کہنے کے مطابق اپنے کام میں لگ گئی۔ سات دنوں اور سات راتوں تک وہ سوئیاں نکالتی رہی۔ جب آنکھوں کی دو سوئیاں باقی رہ گئیں تو یہ نہانے کے لئے قریب کے تالاب پر پہنچی۔ یہاں اُس نے دیکھا کہ ایک شخص اپنے ساتھ ایک نوجوان لڑکی لئے ہوئے بڑی تیزی سے آ رہا ہے۔ کاجل ریکھا کے پوچھنے پر اس آدمی نے بتایا کہ لڑکی اس کی بیٹی ہے۔ غربت سے تنگ آ کر وہ اسے بیچنے کے لئے نکلا ہے۔ جنگل میں ایک سنیاسی نے اسے بتایا ہے کہ مندر میں ایک راجکماری رہتی ہے جسے ایک داسی کی ضرورت ہے۔ کاجل ریکھا سنیاسی کا نام سُن کر اُسے خریدنے پر راضی ہو گئی۔ قیمت دینے کے لئے اس کے پاس پیسہ نہ تھا۔ اپنے ہاتھ کے کنگن اُتار کر دیدیئے اور اسی مناسبت سے اس کا نام کنگن داسی رکھا۔ کنگن داسی سے ریکھا نے کہا کہ وہ مندر میں جائے اور وہاں لاش کے سرہانے جو پتّہ رکھا ہے۔ اس کا رس نکال کر تیار رکھے۔ نادانی یا بھولے پن سے ریکھا نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ لاش اس کے شوہر کی ہے جو جسم پر رس ملنے اور آنکھوں کی سوئیاں نکالنے سے زندہ ہو جائے گا۔

کنگن داسی مندر میں پہنچی، پتے کا رس نکالا۔ مگر راجکمار کو دیکھ کر اس کی نیت ڈانوا ڈول ہو گئی۔ کاجل ریکھا کا انتظار کئے بغیر اس نے وہ رس مل کر سوئیاں نکال دیں۔ راجکمار جی اٹھا۔ اپنے سامنے ایک عورت کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور پوچھا تو کون ہے؟ کنگن داسی نے بتایا کہ اس نے اسے زندہ کیا ہے اور اب احسان کا بدلہ یہی ہو سکتا ہے کہ راجکمار اس سے شادی کر لے۔ احسان مندی کے جوش میں اور کچھ پوچھے بغیر راجکمار راضی ہو گیا۔ یہاں یہ۔۔۔ عہد و پیمان ہو رہے تھے کہ کاجل ریکھا آن پہنچی۔ اس کا حسن و جمال دیکھ کر راجکمار مبہوت سا ہو گیا۔ اور کاجل سے پوچھا "تو کون ہے؟" مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتی۔۔۔ کنگن داسی آگے بڑھی اور کہا: "یہ میری کنیز ہے، میں نے اسے کنگن دے کر خریدا اور اس کا نام کنگن داسی رکھا ہے۔" کاجل ریکھا اس کی عیاری سمجھ گئی۔ مگر سنیاسی کی نصیحت پر عمل ضروری تھا۔ اس لئے خاموش رہی۔ راجکمار بڑا حیران تھا کہ کنیز، رانی سے کتنی زیادہ خوبصورت ہے۔ مگر وہ بھی مجبور تھا۔ جب اس نے بہت اصرار کیا تو کاجل ریکھا نے صرف اتنا کہا۔ "میں رانی کی داسی ہوں۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں میں اس ابر کی طرح ہوں جو آسمانوں پر آوارہ گھوم رہا ہو۔"

راجکمار دونوں کو لے کر اپنے دیس پہنچا۔ مگر اس حال میں کہ کنیز اس کی رانی بنی ہوئی تھی اور رانی کنیز۔ راجکمار ایک بہت بڑے ملک کا حاکم تھا۔ اور اسے سوئی راجہ کہتے تھے۔

جوں جوں دن گزرتے گئے۔ سوئی راجہ کاجل ریکھا کے سلیقے، اخلاق اور کردار کا گرویدہ اور کنگن داسی کے پھوہڑ پن اور بدتمیزی سے بیزار ہوتا جاتا تھا۔ اس نے لاکھ لاکھ جتن کئے کہ کسی طرح کاجل ریکھا کا حسب نسب معلوم ہو۔ مگر کاجل ریکھا بدستور خاموش تھی۔ اسی ادھیڑ بن میں راجہ کا جی اچاٹ رہنے لگا۔ راج پاٹ کے کاموں میں بھی دلچسپی نہ ہوئی۔ چنانچہ اس نے سیر و سیاحت کا ارادہ کیا۔ اپنے وزیر کو راج پاٹ حوالے کیا اور کہا کہ وہ تین مہینے بعد لوٹ آئے گا۔ ساتھ ہی وزیر کو تاکید بھی کر دی کہ وہ اس دوران میں کاجل ریکھا کا حال معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

چلتے چلتے اس نے رانی سے پوچھا کہ وہ اس کے لئے کیا تحفے لائے۔ رانی نے ویسی ہی فرمائشیں کیں جیسی کہ ایک غریب دیہاتی عورت کرسکتی ہے۔ اس کا دل بیوی کی جہالت پر بہت کڑھا۔ مگر صبر کرکے چپ ہو رہا۔ راجہ نے ریکھا سے بھی یہی سوال کیا۔ ریکھا نے جواب دیا کہ وہ تو ایک ادنیٰ کنیز ہے۔ اسے سب کچھ حاصل ہے۔ اب وہ کوئی خواہش نہیں رکھتی مگر جب راجہ نے حد سے زیادہ اصرار کیا تو اس نے کہا کہ اگر ممکن ہو سکے تو ایک مقدس مینا اس کے لئے لیتا آئے۔

رانی کی فرمائشیں تو آسانی سے مل گئیں۔ مگر کاجل ریکھا کی فرمائش ٹیڑھی کھیر تھی۔ اب واپسی کے لئے ایک مہینہ رہ گیا۔ مگر مینا کے مل جانے کی کوئی توقع نہ تھی۔ ادھر راجہ ٹھان چکا تھا کہ بہرحال فرمائش پوری کرے گا۔ آخر گھومتے گھامتے سوئی راجہ اسی شہر میں پہنچا۔ جہاں کاجل ریکھا کا باپ رہتا تھا۔ وہاں ٹھہر کر اس نے منادی کرادی کہ اسے ایک مقدس اور متبرک مینا کی ضرورت ہے۔ یہ اعلان سن کر دھنیشور کو خیال ہوا کہ اس پرندے کا حال سوائے ریکھا کے کوئی اور نہیں جانتا۔ ممکن ہے یہ اسی کی فرمائش ہو اور اس کو اس کی ضرورت ہے۔ اسی خیال سے اس نے راجکمار کے ہاتھ وہ مینا بیچ دی۔ مینا پاکر راجہ بہت خوش ہوا۔ اور وطن لوٹا۔

سوئی راجہ کو اس کے وزیر نے بتایا کہ اس کی عدم موجودگی میں جب بھی اس نے رانی کے مشورے پر کام کیا اسے نقصان پہنچا اور اس کے برخلاف کنیز کے مشورے ہمیشہ مفید ثابت ہوئے۔

سوئی راجہ کو خیال ہوا کہ دونوں کا سلیقہ آزمائے۔ چنانچہ دو دن اس نے اپنے چند دوستوں کی دعوت کی۔ ایک دن سارا انتظام رانی کے ہاتھ میں رکھا اور دوسرے دن کاجل ریکھا کے۔ پہلے دن کھانا ایسا ملا جیسے ایک گنوار کے دسترخوان پر مل سکتا ہے مگر دوسرے دن کا دسترخوان صحیح معنوں میں شاہی دسترخوان تھا۔ پھر ایک تہوار کے موقع پر اس نے دونوں کو ایک ایک مندر سجانے کو کہا۔ یہاں بھی وہی نتیجہ نکلا اور اب راجکمار کا دل رانی کی طرف سے بالکل اٹھ گیا۔ اس نے اس سے ملنا جلنا بھی کم کر دیا۔ زیادہ وقت کاجل ریکھا کے ساتھ کاٹتا۔

کاجل ریکھا کو اپنے باپ سے جدا ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ ایک دن اُس نے مینا سے پوچھا کہ ابھی کتنے دن اس کی گردش کے باقی ہیں۔ اس کے ماں باپ کس حال میں ہیں۔ مینا نے کہا کہ اس کے ماں باپ اس کے غم میں روتے روتے اندھے ہو رہے ہیں۔ مگر ابھی کاجل ریکھا کو دو سال اسی حال میں گذارنے ہوں گے۔

سوتی راجہ کا ایک دوست شونا دھر جو کنچن پور کا راجکمار تھا۔ کاجل ریکھا کے حسن پر بُری طرح فریفتہ ہو گیا تھا اور اُسے حاصل کرنے کی دھن میں لگا ہوا تھا۔ اُسے پتہ چل گیا کہ رانی راجہ کی بے التفاتی کی وجہ سے ریکھا کی جانی دشمن ہو گئی ہے۔ اُس نے موقع کو غنیمت جان کر رانی سے ساز باز کی۔

ریکھا محل کے ایک کمرے میں بالکل تنہا سوتی تھی۔ صرف وہ مینا کمرے میں رہتی تھی۔ ایک رات رانی نے چپکے سے کمرے کی سیڑھی پر سیندور بچھا دیا۔ شونا دھر اس پر سے چلتے ہوئے ریکھا کے کمرے میں گیا اور نکل آیا۔ اس طرح اس کے قدموں کے نشان فرش پر بن گئے۔

تجویز بنی بنائی تھی۔ صبح اُٹھ کر رانی نے سارا محل سر پر اٹھا لیا کہ رات کاجل ریکھا کے کمرے میں کوئی آیا تھا۔ یہ بدکردار ہے اور محل میں رہنے کے قابل نہیں۔ شُدہ شُدہ سوتی راجہ کو خبر ہوئی۔ وہ بھی بڑا برہم ہوا۔ کاجل ریکھا نے لاکھ لاکھ اپنی معصومیت کا اظہار کیا۔ مگر اس کی صفائی کون پیش کرتا۔ جب راجہ نے گواہ مانگے تو اس نے مینا کا حوالہ دیا۔ مگر مینا نے صرف اتنا کہا کہ اسے رات کا حال یاد نہیں۔ تاہم راجہ اگر بدظن ہے تو یقیناً ریکھا کو محل سے نکال دے۔

راجہ نے غضب میں آکر ریکھا کو نکال دینے کا فیصلہ کیا۔ اور شونا دھر سے کہا کہ وہ اسے لے جا کر سمندر کے بیچوں بیچ ایک ویران جزیرے میں چھوڑ آئے۔ شونا دھر کی منہ مانگی مراد بر آئی۔ وہ فوراً تیار ہو گیا۔ کشتی میں ریکھا کو بٹھا کر نکلا۔ راستے میں اُسے اپنی دولت اور حکومت کے قصے سُنا کر اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ مگر ریکھا نے جواب دیا کہ وہ ایک بدکردار عورت ہے۔ باپ نے بچپن میں اسی جرم پر اُسے گھر سے نکالا تھا۔ اور آج راجہ نے بھی محل سے نکال دیا ہے مگر شونا دھر مصر تھا۔ جب اس کا اصرار جبر تک پہنچ گیا تو بے بس ہو کر کاجل ریکھا نے دعا کی کہ سمندر

میں ایک جزیرہ نکل آئے۔ تاکہ کشتی رُک جائے۔ اور وہ اُس کے چنگل سے چھٹکارا پا سکے۔ یہ الفاظ کاجل ریکھا کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ سمندر میں ایک جزیرہ نمودار ہوا۔ کشتی ٹکرا کر رُک گئی۔ ملاح اس واقعہ سے گھبرا گئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ جادوگرنی ہے۔ اب وہ کسی قیمت پر اُسے کشتی میں نہ بٹھائیں گے۔ ملاحوں کی ضد کے آگے شونادھر کی کچھ نہ چل سکی۔ وہ کاجل ریکھا کو جزیرے پر چھوڑ کر واپس لوٹنے پر مجبور ہو گیا۔

کاجل ریکھا کی جدائی نے دھنیشور اور اس کی بیوی کا برا حال کر دیا۔ اسی غم میں گُھل گُھل کر دونوں چل بسے۔ دھنیشور کے بیٹے رتنیشور نے اب کاروبار سنبھالا۔ تجارتی جہازوں کا بیڑہ لے کر وہ ملکوں ملکوں گھومتا پھرتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے اس کا بیڑہ اسی جزیرے پر آ کر رُکا جہاں کاجل ریکھا رہتی تھی جنگل میں اس پیکرِ حُسن و جمال کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اسے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ گھر پہنچ کر ریکھا پہچان گئی۔ مگر رتنیشور اب بھی اُسے نہ پہچان سکا۔ اور اُس سے بیاہ کے لئے اصرار کرنے لگا۔ کاجل ریکھا بڑی مصیبت میں پھنس گئی۔ سنیاسی کی ہدایت کے مطابق وہ خود اپنا نام و نشان نہ بتا سکتی تھی۔ اور اگر نام و نشان نہ بتائے تو حقیقی بھائی سے بیاہ کرنا پڑ رہا تھا۔ آخر اُس نے اپنے بھائی سے کہہ دیا کہ یہ شادی اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ سوئی راجہ کے محل سے اس مقدس مینا کو نہ لے آئے اور اس سے تمام حالات نہ پوچھ لے۔ رتنیشور فوراً تیار ہو گیا اور سوئی راجہ کے دیس کی طرف چل پڑا۔

کاجل ریکھا کے محل سے نکل جانے کے بعد سوئی راجہ کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ راج پاٹ۔ گھر۔ دوست احباب ہر چیز سے اُسے وحشت ہونے لگی۔ اسی وحشت کے عالم میں وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اور کاجل ریکھا کی تلاش میں ملک ملک گھومنے لگا۔ چنانچہ جب رتنیشور اس کے دیس میں پہنچا تو سوئی راجہ وہاں نہیں تھا۔ اور رانی نے پیسے کے لالچ میں مینا اس کے حوالے کر دی۔ مینا کو لے کر رتنیشور خوش خوش گھر لوٹا۔ سارے شہر میں اعلان کر دیا کہ دوسرے دن وہ ایک خوبصورت لڑکی سے شادی کر رہا ہے جس کا حال یہ مینا سنائے گی۔

یہ عجیب و غریب منظر دیکھنے ہزاروں آدمی جمع ہوئے۔ اُن کے سامنے مینا نے دھنیشور اور کاجل ریکھا کی ساری داستان سنائی۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ سوئی راجہ کا باپ اولاد کی بڑی خواہش رکھتا تھا۔ ایک سنیاسی نے اُسے ایک پھل دیا کہ اس کی بیوی کو کھلا دے۔ راجہ کی بیوی نے پھل تو کھا لیا۔ مگر کوئی بداحتیاطی ہو گئی جس سے مردہ لڑکا پیدا ہو گیا۔ راجہ کی منّت سماجت پر سنیاسی نے کہا کہ مردے کے جسم میں سوئیاں چبھو کر اسے فلاں مندر میں رکھ دو، یہ مُردہ بھی زندہ بچوں کی طرح بڑھے گا اور سولہ سال کے بعد اس کی ہونے والی بیوی اُسے زندہ کرے گی۔ یہ سارا افسانہ سُنا کر مینا اُڑ گئی اور نظروں سے غائب ہو گئی۔

اتفاقاً اُس مجمع میں سوئی راجہ بھی موجود تھا۔ یہ قصّہ سُن کر بڑا خوش ہوا۔ رتنیشور سے اجازت لے کر وہ کاجل ریکھا کو پھر اپنے دیس لے گیا۔ مگر اب کی اُسے پوشیدہ رکھا۔ راج پاٹ سنبھالنے کے بعد محل میں ایک گڑھا تیار کرا دیا اور ایک رات اس میں اپنی رانی کو زندہ دفن کر دیا۔ اب کاجل ریکھا محل میں رانی بن کر آ گئی۔ اس خوشی میں بڑے جشن ہوئے اور سب اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔

آئینہ بی بی

مشرقی پاکستان کی سوندھی سوندھی مٹیوں اور قوس قزحی فضاؤں میں اَن گنت لوک گیت اور لوک کہانیاں روپوش ہیں۔ ان کہانیوں اور گیتوں میں بنگال کے صحیح رنگ روپ ملتے ہیں۔ ان میں ملاحوں کے دلوں کی دھڑکنیں ہیں۔ چرواہوں کے دل رس نغمے ہیں۔ ان کے اندر ان کنواری ناریوں کے جذبات کی دبی ہوئی چنگاریاں ہیں جو پنگھٹ کے کنارے اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہیں۔ بارہ ماسی گیت، اساڑھ میں ندیوں نالوں کا شور، جاڑے کی ماتمی شامیں، بھادوں کی چاندنی راتیں، بسنت میں رنگ برنگ کے پھولوں پر بھونروں کی وارفتگی —— ان موسموں کی مختلف کیفیتوں کا اندازہ لگانا ہو تو اُن منظوم لوک کہانیوں کو پڑھیئے جن کے خالق کاشتکار اور ملاح ہیں۔ گاؤں دیہات کے اِن اَن پڑھ شاعروں نے زندگی کے ہر پہلو کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں لفظوں کے جال نہیں بنتے۔ ان کی زبان سیدھی سادی مگر پُر اثر ہے۔ وہ رمزیت اور اشاریت سے گریز کرتے ہیں۔

"آئینہ بی بی" بھی مشرقی پاکستان کی نہایت پُر اثر لوک کہانی ہے۔ اس میں عشق و محبّت کی دل سوزی و دل گرفتگی ہے۔ گاؤں کی گوری کا حسنِ ضیا پاش عشق کی چشم نیم باز کو خیرہ کر رہا ہے۔ دل کی ہر دھڑکن گیتوں کی پھوار بن رہی ہے۔ سہمی سہمی ہوئی عطر بیز سانسیں کھیتوں میں دھان کے خوشوں کو برما رہی ہیں۔ گاؤں کے نوجوان کاشتکار محمود نے آئینہ بی بی کے چندن جیسے

روپ کو دیکھا اور اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا ؂

دیس میں اپنے سندر سندر پیارے پیارے پھول
اس ناری کے روپ کے آگے سب ہے لیکن دھول

محمود کا جذبۂ عشق آئینہ بی بی کے حسنِ معصوم کو تپا گیا۔ وہ ندی کنارے دم بخود نگاہیں نیچی کئے کھڑی رہی اس کا چہرہ شرم کے مارے شفق زار بن گیا۔ وہ نوجوان کے سامنے سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن قدم سو سو من کے ہو گئے۔

محمود بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔ اس کی ماں نے دکھ جھیل کر اسے پالا پوسا اور بڑا کیا سولہ سال کی عمر ہوئی تو اس نے ہل بیل سنبھال لئے۔ کاشت کاری شروع کر دی۔ شب و روز کی محنتوں کا پھل جلد ہی مل گیا۔ دھان کے خوشے سر اٹھانے لگے۔ ہواؤں میں بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی۔ بیٹے کی محنت کا پھل ماں کو سرور و کیف دے گیا۔ اس نے پیر صاحب کی درگاہ میں منّت مانی تھی۔ منّت پوری ہو گئی۔ اس کی کٹیا کے در و بام جھوم اٹھے اور یک بارگی دعاؤں کے لئے اس کے دونوں ہاتھ اُوپر اٹھ گئے۔

مرے پُتر کو آہنی کاٹھ دے
یہاں سورما کی طرح وہ جئے!

محمود سچ مچ گبرو جوان تھا۔ اس کے انگ انگ سے شجاعت و مردانگی کا چشمہ پھوٹ رہا تھا۔ گاؤں کی گوریاں اسے دیکھتیں اور کٹ کٹ جاتیں۔ مگر:

کاٹے نہیں کٹتے ہیں دن جیٹھ مہینے کے
اور آنکھیں جھپکتے ہی ہو جاتی ہے پربھات

محمود کو کسی کل چین نہیں۔ نہ جانے یہ کیسی چبھن ہے۔ اسے کسی پہلو آرام نہیں ملتا۔ ایک انجانا سا درد ہے جس کے باعث اس کا من بیکل ہو رہا ہے۔ اب کھیت میں اس کا جی نہیں لگتا۔ اب ہل بیل اسے خوشی نہیں دیتے، اب تو

"آم پا کے، جام پلا کے کاگا بولے را"

اور "کاگا" کی کائیں کائیں دم بھر کے لئے امید بندھا جاتی ہے کہ اُس کی کٹیا میں ضرور کوئی مہمان آنے والا ہے۔ لیکن اس کی کٹیا میں کوئی نہیں آیا۔ اس کی ماں کی امیدیں بھی پانی کا بلبلہ ثابت ہوئیں۔ حالانکہ:

اسی مہینے گھر ہیں بنائے بن کے سارے پنچھیوں نے
بہو نہ آئی ہائے لیکن بھاگ جلی کی کٹیا میں !!

اب اساڑھ کا مہینہ بھی آگیا۔ میگھ رانی کی سواری دور دور تک جانے لگی۔ سوکھی ندیاں جل تھل بن گئیں۔ گاؤں کے نوجوان کمائی کے لئے دور دیس جانے لگے۔ جدھر آنکھیں اٹھتی ہیں۔ بادبان اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ محمود نے بھی دُور دیس جانے کا قصد کیا۔ بھلا ماں کا دل کیسے مانتا۔ اس نے بیٹے کی منّت سماجت کی۔ اسے بہلایا پھسلایا مگر وہ نہ مانا۔ ماں کی آنکھوں میں اساڑھ کے بادل سما گئے۔ محمود رخصت ہونے لگا۔ آسمان کالی بدلیوں سے ڈھک گیا اور دیکھتے دیکھتے اس کی ناؤ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ چھ ماہ جدائی میں بیت گئے مگر محمود کا کچھ پتہ نہ چلا۔

محمود کی ناؤ ایک انجانے دیس کے کنارے آکر رُکی۔ اس نے ندی کنارے اُگے ہوئے درخت کی جڑ سے اپنی ناؤ کو باندھا۔ وہ گاؤں کے اندر داخل ہوا۔ کچھ دُور چلنے کے بعد اس کی نگاہ ایک کٹیا پر پڑی، چوکھٹ پر ایک بڈھا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ بڈھے نے محمود کو بلایا اور اس سے اپنی کیفیت بیان کرنے لگا۔ اتنے میں آئینہ بی بی ندی سے گاگر بھر کر آگئی۔ اس نے ایک اجنبی جوان کو دروازے پر دیکھا تو:-

شرم کے مارے لال ہوا منہ، تھر تھر کانپے "گا"[1]
جانا چاہا پر نہیں اٹھے کنیا کے دو "پا"[2]

محمود، آئینہ بی بی کے روپ رنگ کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ ایسا بے پناہ حسن اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سر کے کالے کالے بال پاؤں کو چھو رہے تھے۔ آنکھوں میں کناری

[1] گا = جسم [2] پا = پاؤں، بنگلا میں پاؤں کو پا کہتے ہیں۔

تھی جسم کے انگ انگ میں جادو سمایا ہوا تھا، اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

دلیس میں اپنے سندر سندر پیارے پیارے پھول
اس ناری کے رُوپ کے آگے سب ہے لیکن دھول

محمود نے بڈھے سے جب اپنا تعارف کرایا اور ماں باپ کے نام بتائے تو اس کی آنکھیں رو پڑیں۔ بڈھے نے کہا "زمانہ ہوا جب میں اور تمہارے باپ دوست تھے۔ وہ بھی کیا دن تھے ہائے۔" محمود کو اپنے باپ کے بارے میں بہت سی باتیں سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اس نے بڈھے کو سلام کیا اور مؤدب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تک اس کی نگاہیں آئینہ بی بی کے چہرے کا طواف کرتی رہیں۔ پھر وہ رخصت ہو گیا اور اس کی ناؤ پورب دلیس کی سمت بہنے لگی۔

•

محمود کی روانگی کے بعد آئینہ بی بی کی کیفیت دگرگوں ہونے لگی۔ اب اس کی آنکھیں کسی چیت چور کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اب اس نے اپنے من میں محبت کا دیپ جلتا ہوا محسوس کیا۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ شام ہوتی اور کٹیا میں چراغ جلانا بھول جاتی۔ ندی کنارے پنیاں بھرن کو جاتی مگر آنکھیں کسی اور کو تلاش کرتیں اور دل ہی دل میں کہتی جاتی:

اپنے نگر میں کس نگری سے بہہ کر آئی نیا رے
کس نے من میں تیر چلایا، بول ذرا پردیا رے؟
کون بھلا بوجھے گا پیارے اپنے من کو روگ ہے کیا
چنتا ایسا روگ ہے بندھو جس کی نہیں ہے کوئی دوا

لیکن محمود ناؤ لیکر آگے بڑھتا گیا۔ اب پورب سے بہہ کر آنیوالی ہوائیں اس کے من میں کانٹے چبھونے لگیں۔ اس کا جی بیکل ہونے لگا۔ اس نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر لیں لیکن آنکھیں بند کرنے کے بعد بھی اسے چین نہ آیا۔ آئینہ بی بی اس کے سامنے اس طرح کھڑی تھی جیسے آسمان کی گود میں تنہا ایک تارہ جگمگا رہا ہو۔ تین ماہ اسی طرح بیت گئے۔ وہ پھر آئینہ کے گاؤں میں واپس پہنچا

۱؎ دوست

آگیا۔اس نے جتنے مال و اسباب خریدے تھے سب منہ مانگے دام میں بیچ دیئے۔ اس کا من آئینہ سے ملنے کے لئے تڑپ رہا تھا مگر جب کٹیا کے اندر داخل ہوا تو وہاں آدمی تھا نہ آدم زاد۔ اس کے احساسات و جذبات میں جیسے بجلی سی کوند گئی۔ وہاں سے مایوس و نامراد لوٹ گیا کتنے گاؤں گھوم گھوم کر اس نے آئینہ کی تلاش کی مگر لاحاصل۔ اب وہ اپنی جھولی پھیلا کر گھر گھر جانے لگا۔ کہیں سے اس کو بھیک مل جاتی۔ کوئی اسے گالیاں دیتا۔ کسی نے اس کو اُچکا اور لفنگا سمجھا۔ کسی نے پاگل اور دیوانہ گردانا۔ اس طرح تین گاؤں کے اس نے پھیرے لگا دیئے۔

جب شام کا اندھیرا پھیل گیا تو محمود نے دوسرے گاؤں کا راستہ لیا۔ اس وقت گاؤں کی جھونپڑیوں سے دھوئیں کے بادل نکل رہے تھے۔ وہ تھک ہار کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے رات اسی کے نیچے بسر کرنے کی ٹھانی۔

صبح ہوئی تو اس نے اپنا سفر پھر شروع کیا۔ وہ جھولی پھیلا کر بھیک مانگتے مانگتے ایک دروازہ کے پاس آیا کہ اس کی نگاہ ایک لڑکی پر پڑی۔ جھولی ہاتھ سے گر پڑی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔ محمود نے کہا۔

"یہ روپ دھارن میں نے تمہارے لئے کیا ہے پیاری،
تمہاری تلاش و جستجو میں نہ جانے کہاں کہاں مارا پھرا، کتنے
گاؤں کی خاک چھانی۔
یہ سلسلہ لامتناہی چھ مہینے سے جاری تھا۔
جس نے مجھے اس روپ میں دیکھا پاگل سمجھا۔
پیاری میں چاول اور پیسے کی بھیک نہیں مانگتا ہوں
میں تو تمہاری جوانی کی بھیک مانگتا ہوں۔
میں تو تمہاری جوانی کی بھیک مانگتا ہوں، چلو اپنے دیس لوٹ چلیں۔
آئینہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔
"ظالم باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے، یہ ماموں کا گھر ہے۔

چھ ماہ سے میں بھی آنکھوں سے گنگا بہا رہی ہوں۔
جہاں جی چاہے مجھے لے چلو پیارے!
پریت سے بڑھکر اس دنیا میں کچھ بھی نہیں۔
پریت ہی تو رتن ہے، پریت ہی جتن اور گلے کا ہار ہے۔"

ماموں کے لڑکے سے آئینہ کی نسبت طے پائی تھی لیکن وہ محمود کے ساتھ فرار ہو گئی اور اس کے گھر میں آ کر اس نے محمود سے شادی کر لی۔ دونوں بہت خوش تھے۔ محمود جب بھی بازار جاتا آئینہ اس سے فرمائش کرتی۔

"پیارے تم میرے لئے کنگھی ضرور لانا — اور ہاں نتھ اور آسمانی رنگ کی ساڑھی بھی! میں یہ ساڑھی پہن کر ندی کنارے جاؤں گی اور تم مجھے دیکھکر مسکراؤ گے۔ پیارے خوشبودار تیل لانا بھی نہ بھولو۔"

خوشی اور مسرت کے یہ دن مختصر ثابت ہوئے۔ محمود نے پھر دُور دیس جانے کی ٹھانی۔ اساڑھ کے اس مہینے میں وہ دُور دیس جا کر زیادہ سے زیادہ پیسے کمانا چاہتا تھا۔ آئینہ کو جب معلوم ہوا تو اس کی آنکھوں تلے تاریکی چھا گئی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی زندگی کا سورج گہنا گیا ہے۔ وہ اداس ہو گئی۔ اس کا دل بھر آیا اور اسی عالم بے قراری میں وہ محمود سے مخاطب ہوئی:-

"پیارے مجھے چھوڑ کر تم دُور دیس نہ جاؤ
تمہارے بنا یہ پہاڑ سے دن کیسے کاٹوں گی
جوانی کے دنوں میں شوہر تو پھولوں پر بھونرا جیسا ہوتا ہے
پیارے نہ جاؤ
دیکھو ندی کیسا شور مچا رہی ہے،
میں اپنی بھری جوانی کو کیسے سنبھال کر رکھوں گی؟
میرے پاس نہ تو سونا ہے نہ چاندی ہے اور نہ پیتل،

دل میں بس ایک آس ہے تمہاری، اسے نہ توڑو۔"

لیکن محمود نہ مانا اور اپنے دوستوں کو لیکر دُور دیس روانہ ہو گیا۔ چند ہی دنوں کے بعد ہی دوست واپس آئے اور آئینہ کو اطلاع دی کہ ناؤ ڈوب جانے کی وجہ سے محمود بھی زندہ نہ بچ سکا۔ اس خبر کو سن کر آئینہ کو اتنا صدمہ ہوا کہ وہ پاگل ہو گئی اور گھر سے نکل گئی۔ کسی طرح وہ ندی کنارے آئی تھی کہ ایک خانہ بدوشوں کی ناؤ کنارے آگئی۔ اس میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ان عورتوں سے اس نے اپنی حالت زار بیان کی۔ اس کی رودادِ غم سن کر وہ اس حد تک متاثر ہوئیں کہ انہوں نے اس کو اپنی ناؤ میں رہنے کی اجازت دیدی۔ اس کے علاوہ ان خانہ بدوش عورتوں نے محمود کی تلاش میں آئینہ کی مدد بھی کی لیکن "چاند محل" نہ ملا۔ مسلسل تلاش، و جستجو کے بعد آئینہ مایوس نہ ہوئی۔ تین سال تک امیدوں کا گھروندا بنتا اور بگڑتا رہا۔ یکایک ایک دن چرواہے کی زبانی معلوم ہوا کہ جہاں ندی ختم ہو جاتی ہے وہیں "چاند محل" ہے اور اس "چاند محل" میں ایک دلہن شام سے چراغ جلاتی ہے۔ یہ سن کر آئینہ خانہ بدوش ناری کا لباس پہن کر باہر نکلی۔ اس نے جوڑا بھی ویسا ہی باندھا۔ گلے میں تعویذ گنڈے تھے اور سر پر بوجھ۔

ندی پار کر کے آئینہ ٹھیک "چاند محل" کے قریب پہنچ گئی۔ درخت اسی طرح سرسبز تھے اور ان کی شاخوں میں پرندوں نے آشیانے بنا رکھے تھے۔ یہیں اس کا عیش کدہ تھا جہاں اس نے کتنی حسین راتیں گزاری تھیں۔ اس نے جلدی جلدی "چاند محل" میں داخل ہونا چاہا۔ مگر پاؤں سو سو من کے ہو گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آج تین سال کے بعد وہ اپنے گھر آئی ہے۔ آج وہ اپنے "چت چور" سے ملے گی۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے ساڑھی کے آنچل سے آنسوؤں کو پونچھا۔ صحن میں مہندی کا درخت اسی انداز سے کھڑا نظر آیا۔ یہ مہندی کا درخت آئینہ نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ اس "چاند محل" کے در و دیوار میں اس کے کتنے سپنے سانس لے رہے ہیں۔ اس کی تمناؤں کے کتنے دیپ جل رہے ہیں مگر اس "چاند محل" پر آج اس کا اختیار نہیں۔ محمود یعنی اس کے چت چور نے دوسری شادی رچالی ہے اور اب

اس گھر پر اس کی نئی بیاہتا کا راج ہے۔

اس کی ساس اسے پہچان نہ سکی، اس نے پوچھا:۔

"اے لڑکی کون ہے تو؟ کہاں سے آ رہی ہے؟ اس طرح نہ رو۔"

اور آئینہ نے جواب دیا:۔

"کیا بتاؤں میں کون ہوں — ہاں اتنا یاد ہے

کہ جب میں روتی تھی تو تم تڑپ اٹھتی تھیں اور اپنے آنچل سے میرے آنسو پونچھتی تھیں،

مگر اب میری ڈھارس بندھانے والا بھی کوئی نہیں۔"

ساس نے پوچھا:۔

"تو کیا تم واقعی آئینہ ہو جس کے غم میں روتے روتے میری آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی ہے؟ آؤ میرے پاس آؤ اب تم اپنی دکھی ماں کو چھوڑ کر نہ جاؤ۔" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی مگر آئینہ نے خون کا گھونٹ پی کر جواب دیا:

"نہیں میں اس گھر میں نہیں آؤں گی، ہرگز نہیں۔ اب میں یہاں ایک پل کے لئے بھی نہیں آؤں گی، ہرگز نہیں۔ اب میں یہاں ایک پل کے لئے بھی نہیں رہ سکتی۔ اور اتنا کہہ کر آئینہ ناؤ میں بیٹھ گئی اور اس نے دل ہی دل میں کہا:

پنکھ پکھیرو چاند محل کے تم سے اتنا کہتی ہوں

اس کو میرے آنے کی سن گن تک نہ ہو پائے

میرے من کی آشا کیا ہے، اتنی سی بس آشا ہے

سکھی رہے چت چور سجنوا من میرا اور کیا چاہے

آئینہ بی بی کی ناؤ چل پڑی — بہت دور — یہاں تک کہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی اور جب محمود گھر واپس آیا اور اسے معلوم ہوا کہ آئینہ اسے تلاش کرتے کرتے چاند محل تک آئی تھی اور کسی نے اسے روکا تک نہیں تو اس کا ذہن مفلوج ہو گیا۔ وہ گھر سے نکل گیا۔ اور پھر واپس نہ آیا۔

کنول کنڈ

جعفر طاہر

کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں
نئی زندگی چار سو پا رہا ہوں

یہ لہریں یہ ان کے نرالے ترانے
سہانے سروں کے مقدس خزانے

یہ لہریں جو تلوار بھی آئینہ بھی
"توڑے چندر راتی"، "ستی موئینا" بھی

یہ لہریں دکھاتی ہیں کیا کیا تماشہ
سناتی ہیں قاضی کا بھی "بارہ ماشہ"

یہ قاضی کی دولت ہے دولت ہماری
ہے قاضی کی عزت سے عزت ہماری

یہ لہریں یہ ٹھاکر قریشی کے دفتر
یہ "تحفہ" یہ "سیف الملوک" اور "سکندر"

مگن کی طرح موجۂ "ہفت پیکر"
یہ "پدماوتی"، "جائسی" کی طرح پر

کئی نام ان کے کئی کام ان کے
ہزاروں ہی جلوے بہر گام انکے

ادھر ایک ننھی سی کھیتی بھی دیکھو
یہ "مسلم ساہتیہ سمیتی" بھی دیکھو

سنو آج سید الاول کی بولی
یہ سانول کی بولی یہ اول کی بولی

یہ بولی ہے نذرل سے آتش بیاں کی
مشرف کی اور کیقباد جواں کی

یہ لہریں سناتی ہیں "شیشر شکوہا"
سناتا ہوں میں ان کو ہاشم کا دوہا

وہ کہتی ہیں آؤ کوئی بیٹھ جاؤ
کوئی ہیر کے دیس کا گیت گاؤ

•

ڈھولا ٹریا ویندا ایں پئی چنڑدی پھٹی
تیری سوہنڑی صورت میری جندڑی لٹی
سیتو تہتڑی مٹھی
ڈھولا ٹریا ویندا
ڈھولا ٹریا ویندا ایں پئی ویلاں پھٹی
ڈھولا مانڑ کرے میں وی رسیم رٹھی
میں وی ڈاڈھی پٹھی
ڈھولا ٹریا ویندا............
ڈھولا ٹریا ویندا ایں پئی رکھدی پھٹی
ڈھولے مڑ کے جوں تکیا ایں ہس کے اٹھی
سیتو دلڑی کٹھی
ڈھولا ٹریا ویندا..............
ڈھولا زمیاں دا راجہ میں چن دی گھٹی
ڈھولا آپے آیا میری سونہہ دی رہٹی
میں تاں چوری کٹی
ڈھولا ٹریا ویندا..............
ڈھولا ٹریا ویندا بیٹھی منگدی دعائیں
شالا خیر ہووی، ڈھولا وطناں تے آئیں
شالا ملیس چھٹی
ڈھولا ٹریا دیندا.....

گیت سنگیت کی ہنس ہنس کے ابھرتی لہریں
رقص کرتی ہوئی گن گیر کنارے پریاں

ڈولتے جسم پہ پیلنوں کے تھرکتے بجرے
سانوری بانہوں کی جھنکار پہ گاتے گجرے
پھول جوڑوں میں سجائے ہوئے سجرے سجرے
نلچتے نینوں میں کجراج ہے منڈل باندھے
ناگ جس طرح کنول کنڈ پہ کنڈل کاڑھے
پتلے ہونٹوں پہ ہنسی جیسے کسی وادی میں
حوریں سرگوشیاں کرتی ہوں خدا کے بارے
یہ کمر مار کے چلتی ہوئی دوشیزائیں
یہ لٹک چال، گگن کھیل، کھڑی لہرائیں
اور گماں ہو کہ سمے ناچ رہا ہے مادھو!
گہری لالی سے دہن لعل کا چھلا گویا
بات جس طرح خدا سوچ کے خوش ہوتا ہو
بال جس طرح کسی روح کی بھیانک راتیں
تہ بہ تہ، حلقہ بحلقہ، یم جولاں پیچاں
جس طرح سایوں میں گھلتے ہوئے لاکھوں سائے
جس طرح موت کی بڑھتی ہوئی لہریں، ہائے
کشتیاں، کتنے بھنور جال، یہ مانجھی بھائی
بالدا باغ سے گاتی ہوئی خوشبو آئی
لڑکیاں، بالے، دکاں دار، کوی متوالے
ہائے یہ شہر یہ اس شہر کے رہنے والے

•

ڈھکنی سے اک شہر ڈھکا اور ڈھاکہ جس کا نام
سیلس نوائے سورج راجہ روج کرے پرنام
محل دو محلے جگمگ جگمگ امریتی کا مان
باڑی، باغ، بغیچے پگ پگ پریوں کے استھان
ہرے بھرے بانسوں کے جنگل پریم شوالے لاکھ
ملکر گائیں ان رمنوں میں ساون اور بیساکھ
یہ شوبھا یہ جوبن یہ رچنا یہ روپ سروپ
چپ کی چھاؤں شیتل ٹھنڈی ہنسی کنواری دھوپ
چکر مکر لہرائیں، ناچیں، ساگر ناچ سدا
دھن تا گے دِھن دھن ناؤ کتا دھے نک تا
ہنس ہنس کر وے پھول جو ماریں منش بنیں حیوان
طوطا، مینا، بکری، بلی، گھوڑا، ہرن، ہوا آن
رات کو ران میں سوئی چبھوئیں اور سجائیں سیج
گنگا جل کے چھینٹے ماریں، ملے انوکھا تیج
جادو چھڑیاں، بس کی پڑیاں، تریا ترس کی بات
جھیل کنارے، چندا تارے، پیا ملن کی رات
دان ہیں دیں پردیسیوں کو جیون کی سندر جوت
آنکھ ملا کر لک چھپ جائیں، کون لگائے چھوت
ہر صورت پدما کی مورت کوئی میل نہ کھوٹ
منوا للک لہکارے بچریں ہوں لہلوٹ
جنم سوارتھ، جنک ستا، سیتاؤں کے بھاگ
اوپر اوپر پانی پانی اندر اندر آگ

S.WAN ۵۱

یہ پُروا کی میٹھی تانیں، بادل بہتے خواب
پاؤں دھریں تو دھرتی ساری عود، عبیر گلاب
گاتی گلیاں، ہنستے ہاٹ، ہمکتے سندر باٹ
یہ دریا کا پاٹ، چمکتا چاند، چھلکتے گھاٹ
ڈھولے جھومیں ڈامبرو باجیں، کلمہ، حمد، اجان
گنگا جل میں بامن پتریاں آن کریں اشنان
چاند سے ملکر ہولی کھیلیں، گائیں راگ بسنت
روپ ندھان، پدم پرتاپ، منوہر مکھ جسونت
جس البیلی نار کو دیکھو وہ لالوں کی لال
تن پھولوں کی گٹھڑی، بھیگے بال، بھڑکتے گال
کون کوی ہے جو نہیں لیوے انکی خاطر جوگ
لیکن میر آسین سے میراجی والا سنجوگ
یہ ڈھاکہ ہے ڈھاکہ دیکھو اس کے دوار ہزار
اس کی باون گلیاں بابو اور ترپّن بازار

فردوس بر روئے زمیں

گلعذار شہر عاج

گلعذار شہر عاج

عاصمہ حسین

دور اک وادی ہے سیم و نور کی
جیسے ہو تصویر کوہ طور کی
چار جانب برف کا گویا ہے راج
اس لئے کہتے ہیں اس کو شہر عاج
عاج کے تختے بچھے ہیں ہر طرف
عاج کے ایواں بنے ہیں ہر طرف
عاج ہی کے راستے نرم و گداز
محو حیرت جن سے ہوں آئینہ ساز
عاج ہی کا فرش تا حدِ نظر
عاج سے آراستہ کوہ و کمر
راستے گھر بار ہاتھی دانت کے
برج اور مینار ہاتھی دانت کے

سینکڑوں طائر قطار اندر قطار
جیسے ہاتھی دانت کے دراج وسار
عاج ہی کی بلبلیں اور قمریاں
عاج کی مانند بھیڑیں بکریاں
عاج کے پودے بھی تھے اشجار بھی
عاج کے تھے پھول بھی اثمار بھی
عاج کی پھیلی ہوئی وہ کونپلیں
جیسے پھلجھڑیاں ہوں باغ و راغ میں
چلتی پھرتی عاج ہی کی مورتیں
جو نظر آئیں بشر کی صورتیں
یہ چمکتا اُجلا اُجلا شہرِ عاج
سر پہ تھا دادی کے اک چاندی کا تاج
عاج کی وہ گوری گوری ناریاں
نور کی چھچھلی ہوئی کلکاریاں
خلد زارِ روح و نظارہ تھا وہ
حسن کا سرمست گہوارہ تھا وہ
وجد میں کہتے تھے لب بے اختیار
حسن زار! اے حسن زار! اے حسن زار!
یہ فسوں پرور دیار مرمریں
اس میں تھی اک شاہزادی نازنیں

ایک زندہ عاج کی مورت تھی وہ
سر سے پا تک صندلی مورت تھی وہ
ہاتھ عاج اور پاؤں عاج اور چہرہ عاج
اس کے زانو عاج ، اس کا سینہ عاج
نام اس کافر ادا کا "گلعذار"
شاھدِ سیمیں بر و سیمیں کنار
ناگہاں شہزادۂ بے خانماں
چلتے چلتے ہوگیا وارد وہاں
جس کا تھا اپنا ہی گویا یہ دیار
اک جہانِ مطلعِ نورالنہار
اک ندی میں پانی پینے کو جھکا
ہاتھ میں پانی کا اک کاسہ لیا
آئی پانی میں نظر ایسی پری
سر بسر آئینہ دارِ دلبری
اس نظارے سے وہ حیراں رہ گیا
دست بر دل، شعلہ در جاں رہ گیا
جب نظر اوپر اٹھائی کچھ نہ تھا
وہ طلسمِ سیمیائی کچھ نہ تھا
بھر لیا کاسے میں پانی اک ذرا
پھر نظر آئی وہ شکلِ دلبربا

سامنے دیکھا تو تھی اک نازنیں
اک پری وش زہرۂ ناز آفریں
ہو گیا مدہوش شانِ جلوہ سے
جیسے اس میں سحر کے انداز تھے
ہوش میں آیا تو ساتھی سے کہا
میں نے دیکھا ایک طرفہ ماجرا
اک پری آئی نظر ندی کے پار
دیدہ و دل ہو گئے جس پر نثار
میں نے دیکھا تو وہ صورت موہنی
اک کنول سے اس نے فوراً ڈھانپ لی
دیکھتا تھا میں تو مسکاتے ہوئے
عاج کی ڈبیا نکالی جیب سے
دور سے ڈبیا کو دکھلایا مجھے
ناز کے تیروں سے برمایا مجھے
تب سے میں سرگشتہ و مبہوت ہوں
ہو نہ ہو اس میں تھا اندازِ فسوں
ہو نہ جب تک اس پری وش سے وصال
ہے سکونِ دل مرے حق میں محال
سن کے ساتھی نے کہا ابنِ وزیر
یوں کہا ہو گی یہ حورِ بے نظیر

شاہزادی "گلعذار" شہرِ عاج

حسنِ عالم جس کو دیتا ہے خراج
کامیابی ہوگی کوشش سے نصیب
فتح و نصرت کد و کاوش سے نصیب
مدتوں شہزادہ سرگرداں رہا
در بدر کی ٹھوکریں کھایا کیا
پر اُسے مل کر رہی وہ گلعذار
اپنے کاشانے میں لوٹا کامگار

آج بھی موجود شہرِ عاج ہے
جو کہ خوبی میں جہاں کا تاج ہے
وہ بذاتِ خویش ہے اک گلعذار
حسن میں چشم و چراغِ روزگار
اور اک شہزادۂ بے خانماں
بے سر و سامان و بے تاب و تواں
دل میں رکھتا ہے تمنائے وصال
کھینچتا ہے اس کو افسونِ جمال
ہے مسلسل بے محابا گرمِ کار
شعلہ زن سینے میں شوقِ گلعذار

گرچہ ہے رستے میں سو سدِ گراں
یہ تگا پو ہوگی آخر کامراں
امتحاں کے مرحلے دشوار ہیں
دشت رستے میں بہت پرخار ہیں
اس کو ملنی ہے مرادِ انجام کار
منقلب ہوگی ہوائے روزگار
کامیاب و کامراں ہو جائے گا
چشمۂ عشرت رواں ہو جائے گا

(مسلم پرنٹنگ پریس۔ کراچی)